”جمّوں وکشمیر کے اُردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات“

مقالہ برائے

پی۔ایچ۔ڈی۔اُردو

نگراں	:	مقالہ نگار
پروفیسر شکھ چین سنگھ	:	جوگیندر سنگھ

شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی، جموں توی -۱۸۰۰۰۶

۲۰۱۷ء


Photo
Lab

POST GRADUATE DEPARTMENT OF URDU

UNIVERSITY OF JAMMU,JAMMU,180006

CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled: **"JAMMU-O-KASHMIR KE URDU ADAB PAR TARAQQI PASAND TEHREEK KE ASRAT"** submitted by Mr. **JOGINDER SINGH** has been completed under my supervision.

The thesis is of worthy consideration for the award of degree of Doctor of Philosophy(Ph.D) in Urdu.

I certify:-

i) That the thesis embodies the work of the candidate himself.

ii) That the candidate has put in the required attendances and seminars in the Department during the research period.

iii) That the candidate worked under the supervision of Dr. Chaman Lal for the period required under statutes.

iv) That the candidate has fulfilled the statutory conditions as laid down in section 18.

Countersigned by :

H.O.D Deptt. Of Urdu.

University of Jammu.

Supervisor

Prof. Sukh Chain Singh

Deptt. Of Urdu University of Jammu

فہرست

﴾..☆ ☆ ☆ ☆..﴿

..... پیش لفظ .....

جمّوں وکشمیر میں اُردو زبان کا آغاز ڈوگرہ عہد میں ہوا ہے۔ڈوگرہ حکومت کے بانی مہاراجہ گلاب سنگھ کے زمانے میں فارسی کو درباری زبان کا درجہ حاصل تھا۔جمّوں کے زیادہ تر علاقوں میں ڈوگری زبان بولی جاتی تھی جولسانی اعتبار سے کسی حد تک اُردو اور پنجابی سے قریب ہے۔جمّوں وکشمیر کے بعض دیگر علاقوں میں اُردو زبان کے علاوہ علاقائی بولیاں بھی بولی ہیں یہی وجہ ہے کہ اُردو زبان نے اپنے کردار کو برقرار رکھا ہے اور اپنی لِسانی تشکیل میں اِن سے مدد بھی لی ہے اور ریاست جمّوں وکشمیر اور لدّاخ کے تینوں خِطوں کو اپنی اِنفرادیت سے جوڑ رکھا ہے۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دیوان کرپا رام کو وزیر اعظم کا مرتبہ حاصِل تھا، جو فارسی کی کئی کتابوں کے مُصنف ہونے کے علاوہ اُردو میں بھی دسترس رکھتے تھے۔دیوان کرپا رام ہی وہ پہلا شخص ہے،جس نے اپنی ذہانت اور علمیت کی بنیاد پر ریاست کی انتظامی صورتِ حال کو رپورٹوں کی صورت میں مرتب کیا۔ مُحققّین نے ان رپورٹوں کو ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو کا نقش اوّل قرار دیا ہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں ہی 65-1864ء میں چودھری مہتہ شیر سنگھ نے بخارا کا سفر کیا، واپسی پر اُنھوں نے جو سفر نامہ لکھا وہ اُردو میں لکھا۔ اس سفر نامے کو ریاست میں سرکاری طور پر اُردو کی اوّلین تحریر کہا جاتا ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اپنے عہد میں اُردو زبان کی بڑھتی مقبولیت کے پیشِ نظر ''بدیا بلاس'' پریس اور ''بدیا بلاس'' اخبار جاری کیے۔ اس پریس اور اخبار نے ریاست میں اُردو زبان وادب کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اسی عہد میں پنڈت ہر گوپال کول خستہؔ جیسے قابلِ قدر ادیب وشاعر پیدا ہوئے، جو اپنی خُداداد صلاحیتوں کی بنا پر 1876ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ انہوں نے اُردو زبان وادب کی ترقی میں کئی کارنامے انجام دیے، جن میں ''گلدستۂ کشمیر'' اور ''گلزارِفوائد'' اہم تصانیف ہیں۔ ''گلدستۂ کشمیر'' کو جمّوں وکشمیر میں اُردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دیا گیا ہے، جو پروفیسر حامدی کاشمیری مطابق 1873ء میں لکھی گئی۔

رنبیر سنگھ کے بعد مہاراجہ پرتاب سنگھ نے اُردو کی اہمیت اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے 1889ء میں سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا اور اسے دفتری اور تعلیمی اداروں میں رائج کردیا۔ اس طرح اُردو کی ترویج وترقی میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دورِ حکومت میں ہر گوپال کول خستہ کے چھوٹے بھائی سالگ رام سالکؔ نے اُردو ادب کے حوالے سے بہت اہم کارنامے انجام دیے۔

مہاراجہ نے سالکؔ سے ''مورتی منڈن''، ''دھرم اُپدیش''اور ''شاستر ارتھ'' جیسی دھارمک کتابیں مرتب کروائیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ''لغاتِ اُردو'' اور ''محاوراتِ اُردو'' کے نام سے بھی کتابچے مرتب کیے۔ لیکن اُن کے خالص ادبی کارناموں میں ''گنجینۂ فطرت''، ''داستانِ جگت روپ''اور ''تحفۂ سالک'' کا شمار ہوتا ہے۔

1924ء میں جمّوں سے پہلا اُردو اخبار ''رنبیر'' ملک راج صراف نے جاری کیا۔اس کے بعد کشمیر سے ''وِتستا''، ''ہمدرد''، ''صداقت''، ''مارتنڈ''، ''وکیل''، ''حقیقت''، ''خالد''، ''خدمت'' وغیرہ جیسے متعدد اخبارات جاری ہوئے۔ ان اخبارات میں ادیبوں اور شاعروں کی ادبی تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں جن سے جمّوں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کے فروغ میں کافی مدد ملی۔ آزادی کے بعد متعدد اخبارات اور رسائل جاری ہوئے۔آج جمّوں وکشمیر سے ''شیرازہ''، ''حکیم الامت''، ''تعمیر''، ''بزم ادب''، ''تفہیم''، ''آفتاب''، ''کشمیر عظمیٰ''، ''اطلاعات''، ''اُڑان''، ''سرینگر ٹائمز''، ''تسکین''، ''ہندوستان چٹان'' وغیرہ سینکڑوں روز نامے اور ہفتہ وار اخبارات شائع ہو رہے ہیں، جو ادبی تخلیقات، تحقیقی وتنقیدی مضامین اور کالم وغیرہ شائع کر کے ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو زبان اور شعر وادب کو پروان چڑھانے میں مصروف ہیں۔ چوں کہ اُردو ریاست کی سرکاری، درباری، دفتری اور کاروباری زبان کے علاوہ ذریعۂ تعلیم بھی رہی

ہے اور آج بھی ریاست کے ہزاروں اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹوں میں اُردو تعلیم کا انتظام ہے۔ جمّوں، کشمیر اور لدّاخ میں ریڈیو اسٹیشن اور ٹیلی ویژن سینٹر سے اُردو کے پروگرام بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ ریاست میں سرکاری و غیر سرکاری ادبی و ثقافتی انجمنیں اور ادارے بھی قبل آزادی سے لے کر آج تک اُردو زبان کے فروغ میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ جن میں ''انجمن ترقی اُردو''، ''انجمن فروغ اُردو''، ''رسا جاودانی میموریل لٹریری سوسائٹی''، ''جمّوں کشمیر اُردو اکیڈمی (نور شاہ)''، ''کلچرا کیڈمی جمّوں وکشمیر'' اور ''تحریکِ بقائے اُردو'' وغیرہ اُردو کی توسیع و ترقی میں پیش پیش ہیں۔

دیکھا جائے تو اُردو زبان و ادب نے ڈیڑھ دوسو برسوں میں ہی ریاست جمّوں وکشمیر میں اتنی ترقی کر لی ہے جتنی کہ برصغیر ہند و پاک کے دوسرے ادبی مراکز ''لاہور''، ''حیدر آباد''، ''دہلی''، ''لکھنؤ'' وغیرہ نے کم و بیش ایک ہزار سال میں کی ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کو بعض مسائل کا سامنا ضرور ہے لیکن اِس ریاست میں اُردو کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ جمّوں وکشمیر میں اُردو کا مستقبل شاندار اور محفوظ نظر آتا ہے۔

1947ء سے قبل جمّوں وکشمیر میں جن شاعروں اور ادیبوں نے اُردو زبان و ادب کو فروغ بخشا ان میں رامانند ساگرؔ، پروفیسر نند لال کول طالبؔ، پریم ناتھ پردیسیؔ، پریم ناتھ در، قدرت اللہ شہاب، ٹھاکر پونچھی، کنول نین پرواز، شہہ زورؔ کاشمیری،

شوریدہ کاشمیریؔ ،محمد الدین فوقؔ ،محمد عمر نور الہیٰ ، غ۔م۔ طاؤسؔ ،غلام رسول نازکیؔ ، عبدالحق برقؔ ، قیصر قلندر اور کئی شعراء و ادباء ہیں جنھوں نے آزادی سے قبل ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو کو فروغ دیا بل کہ مذکورہ فنکار اپنی تخلیقات کی بدولت پنجاب اور دلی کے اُردو داں طبقوں میں اپنا لوہا منوانے میں کامیاب رہے ہیں۔

تقسیمِ ملک سے لے کر عصر حاضر تک جمّوں وکشمیر میں اُردو زبان و ادب کی آبیاری کرنے والوں میں شمیم احمد شمیمؔ ،حامدیؔ کاشمیری ،محمد یوسف ٹینگ ،اکبر حیدری ، اکبر لدّاخی ،پشکر ناتھ ،تیج بہادر بھان ، برج پریمیؔ ،مخمور بدخشی ،غلام نبی خیالؔ ،سلطان الحق شہیدی ،حکیم منظور ، پرتپال سنگھ بیتابؔ ،آنند لہر ،خالد حسین ،نور شاہ ، رفیق راز ، بلراج بخشی ،اکبر جے پوری ، ویندر پٹواری ،محمد زمان آزردہ ،قدوس جاوید ،مظفر ایرج ، ہمدم کاشمیری ،عرش صہبائی ، عابد مناوری ، قاضی غلام ، ریاض پنجابی ، بشیر کلد یپ ، شجاع سلطان ، شبنم قیوم ،ترنم ریاض ،ظہور الدین ،محمد علی حسینی ، ،غلام رسول ملک ،شہباز راجوروی ، صابر مرزا ،ثنا اللہ بٹ ،صوفی غلام محمد ، رخسانہ جبیں ،نسرین نقاش ،شفیقہ پروین ، عارفہ بشریٰ ، جاوید آزر ، پریمی رومانی ،فرید پربتی ،خالد بشیر ،شمس الدین شمیم ، شفق سوپوری ، زاہد مختار ،احمد شناس ، فاروق نازکی ،قاسم سجاد ،مبشر رفاعی ، یوسف عاجز ، جی ۔ ایم آجر ، حسن ساہو ، شبیب رضوی ، وحید احمد اندرابی ، بشیر احمد نحوی ، مجید مضمر (مرحوم) نذیر ملک ،شہاب عنایت ملک ،نصرت آراء چوہدری ،ضیاء الدین ،

محمد ریاض احمد، اسد اللہ وانی ، ریاض تو حیدی، مشتاق احمد وانی، الطاف انجم ، سلیم سالک ، خالد کرار، راہگیر لدّاخی وغیرہ کے نام سرِ فہرست ہیں ۔جنہوں نے اپنی محنت، لگن، لیاقتِ علمی اور محبت و خلوص سے جمّوں و کشمیر میں اُردو کی آبرو مستحکم اور برقرار رکھنے میں پیش پیش رہے ہیں۔

مذکورہ شعراء و ادباء نے جہاں ایک طرف روایتی موضوعات کو پیش کیا ہے وہیں دوسری طرف اقوامی اور بین الاقوامی سطح پر چل رہی تحریکوں کے اثرات بھی قبول کیے، جو ان کی تخلیقات میں صاف نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی کی شروعات میں ریاست کے اندر جنگ جیسے حالات بن چکے تھے۔ یہاں کی قومیں شخصی راج سے تنگ آکر ان کے خلاف سراپا احتجاج ہو گئیں تھیں۔ پوری ریاست کے حالات بدتر ہو چکے تھے اور یہاں کی عوام سیاسی، سماجی اور معاشی بدحالی کا شکار تھی۔ ان حالات کو منظّم کرنے کے لئے ملک کی طرح ریاست میں بھی'' Progressive writers association'' کا انعقاد کیا گیا۔ جس کے پرچم تلے یہاں کے فنکاروں کو نئے موضوعات کا پلیٹ فارم فراہم کیا گیا جو ترقی پسند تحریک کا ہی ایک حصّہ تھا۔ ریاست میں جن شعراء نے ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر شاعری کی اُن میں حامدؔی کاشمیری، شہہ زورؔ کاشمیری، غلام رسول نازکؔی، عرش صہبائؔی، شفقؔ سوپوری، پرتپال سنگھ بیتابؔ، احمد شناسؔ قابلِ ذکر ہیں۔

اُردو شاعری کے ساتھ ساتھ یہاں کی اُردو نثر کی بھی مختلف اصناف کو فروغ حاصل ہوا۔ جب یہاں افسانے کا آغاز ہوا تو ملکی سطح پر ترقی پسند تحریک عروج پر تھی۔ اس کے اثرات یہاں کے ادیبوں اور فنکاروں پر بھی پڑے۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوکر جن ادیبوں نے افسانے اور ناول لکھے اُن میں پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، کشمیری لال ذاکر، رامانند ساگر، نرسنگھ داس نرگس اور ٹھاکر پونچھی وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات یہاں کے عوام کی تڑپتی اور سسکتی زندگی کا حال، بھوک، افلاس اور معاشی استحصال وغیرہ ہیں۔ ان فکشن نگاروں کی تخلیقات میں بھی وہی موضوعات وواقعات دیکھنے کو ملتے ہیں جو ترقی پسندوں کا خاصہ رہے ہیں۔

جمّوں وکشمیر میں غیر افسانوی نثر کو فروغ دینے والے ادیبوں میں پنڈت سالک رام سالک، چودھری غلام عباس، شیخ عبداللہ، ڈاکٹر کرن سنگھ، قدرت اللہ شہاب، ثریا خورشید، سید میر قاسم، سید علی شاہ گیلانی، محمد زمان آزردہ، برج پریمی، شمیم احمد شمیم، غلا رسول سنتوش، محمد یوسف ٹینگ، پروفیسر شہاب عنایت ملک اور ثنا اللہء، وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان ادیبوں اور سیاست دانوں نے جمّوں وکشمیر میں غیر افسانوی ادب کی مختلف اصناف مثلاً انشائیہ، خاکہ، سفرنامہ اور خودنوشت وغیرہ کی آبیاری کی ہے۔ جمّوں وکشمیر میں اگر چہ ان اصناف کا ذخیرہ کم ہے لیکن ان کے خاکے، انشائیے اور سوانحی تصانیف فنی وادبی اور تاریخی وتاثراتی خوبیوں سے مالا مال ہیں۔ غیر افسانوی

تخلیقات میں مُصنفین نے نہ صرف مختلف مما لک میں اپنی مصروفیات پر روشنی ڈالی ہے بل کہ ان مما لک کے تہذیبی ، ثقافتی ، سیاسی ، سماجی ، معاشی اور جغرافیائی حالات و واقعات سے بھی قارئین کو روشناس کیا ہے۔خصوصاً جمّوں وکشمیر میں لکھی گی خودنوشتوں میں یہاں کی ادبی شخصیات کے بجائے سیاسی رہنماؤں ، سرکاری ملازموں اور جمّوں وکشمیر کی تہذیبی ،ثقافتی، سیاسی اورتاریخی صورتحال زیادہ نمایاں ہے،جن میں کہیں واضح اورکہیں اشاراتی انداز میں ترقی پسند عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ریاست جمّوں کشمیر میں اُردو زبان کی تشکیل کا عمل اس ریاست میں مسلم دورِحکومت کے قیام اور فارسی داں اوّلیا اکرام کی آمد کے بعد شروع ہوتا ہے اورڈوگرہ حکومت کے قیام تک اُردو میں شعری اورنثری تخلیقات کی پیش کش کا سلسلہ بھی شروع ہوا تھا۔1889ء میں اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کے بعد سے 1947ء تک جمّوں وکشمیر کے شاعروں اورادیبوں نے اُردو شعر و ادب کے سرمائے میں ہر پہلو سے اضافہ کیا۔ریاست میں اُردو شاعری اور افسانوی ادب کا آغاز اگر چہ ڈوگرہ عہد میں ہوتا ہے لیکن صحافت ، تحقیق وتنقید اور غیر افسانوی نثر کا باقاعدہ ارتقا1947ء کے بعد ہوا ہے۔آج ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کی صورت حال بعض خامیوں کے باوجود اتنی ہمہ جہت اوراطمینان بخش ہے کہ جمّوں وکشمیر کو بھی دہلی ،لکھنؤ ،لاہور، کراچی ، عظیم آباد وغیرہ کی طرح اُردو کا

ایک اہم مرکز مانا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں شعبۂ اُردو کی ریسرچ کمیٹی نے میرے لئے ''ریاست جمّوں وکشمیر کے اُردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات''، جیسے موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ تحقیقی اصولوں کے مطابق میں نے اپنے مقالے کو درج ذیل ابواب میں تقسیم کیا ہے:

باب اوّل:

''جمّوں وکشمیر کا اُردو ادب: ایک مطالعہ''

باب دوئم:

''اُردو شاعری پر ترقی پسند تحریک کے اثرات''

باب سوم:

''اُردو افسانے پر ترقی پسند تحریک کے اثرات''

باب چہارم:

''اُردو ناول پر ترقی پسند تحریک کے اثرات''

باب پنجم:

''غیر افسانوی ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات''

باب ششم:

حاصل مطالعہ

مقالے کے پہلے باب میں، میں نے جمّوں وکشمیر میں اُردو ادب کے آغاز و ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈوگرہ عہد سے لے عصرِ حاضر تک کے ادب کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اس جائزے میں نثری اور شعری اصناف کے علاوہ اُن انجمنوں اور اداروں کا ذکر بھی شامل ہے جنہوں نے جمّوں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کو ترقی دینے میں اہم رول ادا کیا۔

مقالے کے دوسرے باب میں یہاں کی شاعری پر ترقی پسند عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے غلام رسول نازکیؔ، رساؔ جاودانی، راحمٰن راہیؔ، قیصر قلندرؔ، عرش صہبائیؔ، پرتپال سنگھ بیتابؔ، احمد شناسؔ وغیرہ کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔

تیسرے باب میں واضح کیا گیا ہے کہ جمّوں وکشمیر میں اُردو افسانے کا آغاز باضابطہ طور پر ترقی پسند تحریک کے زیر اہتمام ہوا اور ریاست جمّوں وکشمیر میں پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، کشمیری لال ذاکر، رامانند ساگر، نرسنگھ داس نرگس اور ٹھاکر پونچھی وغیرہ کے تخلیقات میں ترقی پسند تحریک کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالے کے چوتھے باب میں جموں وکشمیر کے ناولوں پر ترقی پسندی کے اثرات کو واضح کرتے ہوئے بتایا گیا ہے اس تحریک کے زیر اثر یہاں کے ناولوں میں عوام کی تڑپتی اور سسکتی زندگی کا حال، بھوک، افلاس اور معاشی استحصال جیسے موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔

پانچویں باب میں انشائیہ، خودنوشت، سفرنامے وغیرہ جیسی غیرافسانوی اصناف میں ترقی پسند عناصر ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔

مقالے کا آخر میں ''حاصلِ مطالعہ'' ہے۔اس باب میں سارے مقالے کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔اور ہر باب میں اختصار کے ساتھ مجموعی طور پر خاکہ پیش کیا گیا ہے تاکہ پورے مقالے کا ماحصل سامنے آسکے۔

مقالے کے آخر میں، میں نے اُن کُتب ورسائل کی فہرست درج کردی ہے جن سے دورانِ تحقیق میں نے استفادہ کیا ہے۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ بعض خامیوں اور کمیوں کے باوجود میرے اس کام کو سراہا جائے گا، تاکہ مجھے مزید تحقیق کرنے کا موقعہ ملے۔

سب سے پہلے مَیں بھگوان کا شکرادا کرتا ہوں جس نے مجھے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی قوت عطا کی۔ چوں کہ ایک ریسرچ اسکالر کو اپنے تحقیقی مقالے کے دوران مختلف منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔اسی طرح ان مشکل راستوں سے میرا بھی گزر ہوا۔

مَیں اپنے نگراں پروفیسر سُکھ چین سنگھ کا ازحد احسان مند ہوں جن کی نگرانی کے بغیر میرا یہ تحقیقی کام مکمل نہیں ہو پا۔ اُنھوں نے قدم قدم پر میری بھرپور

رہنمائی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے نیک مشوروں سے بھی نوازا اور اس مقالے کے ابواب کی ترتیب و تنظیم میں میری ہر ممکن رہنمائی بھی کی۔ اُنھوں نے دورانِ تحقیق نہ صرف ایک شفیق استاد بل کہ ایک رفیق رہنما کی طرح میرا ساتھ دیا۔

میں صدرِ شعبہ پروفیسر شہاب عنایت ملک صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی کرم فرمائی کی وجہ سے مَیں یہ مقالہ لکھنے کے اہل ہو سکا۔ میں شعبہ کے تمام اساتذہ کا شکرگزار ہوں جن میں پروفیسر ضیاء الدین، ڈاکٹر محمد ریاض احمد، ڈاکٹر چمن لال بھگت، ڈاکٹر عبدالرشید منہاس اور ڈاکٹر فرحت شمیم کے نام اہم ہیں۔ علاوہ ازیں شعبہ کے غیر تدریسی ممبران کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کا تعاون کسی نہ کسی صورت میں میرے شاملِ حال رہا ہے۔

مَیں اپنے والدین کا نہایت ہی مشکور و ممنون ہوں جنھوں نے میرے تعلیمی سفر کے آغاز سے اب تک نہ جانے کتنے دُکھ میری خاطر برداشت کیے۔ میری تعلیم کی خاطر انھوں نے ہر مشکلات کو خوشی سے گلے لگایا۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ اور میرے اس مقالے کا ایک ایک حرف میرے والدین کی نیک خواہشات کا نتیجہ ہیں۔ مَیں جو بھی ہوں ان کی دعاؤں کا ثمرہ ہوں۔

ناانصافی ہوگی کہ اگر مَیں اپنے بھائیوں منجیت سنگھ اور وریندر سنگھ کا شکریہ ادا نہ کروں کیوں کہ انہیں بھائیوں کی وجہ سے میں گھریلو زندگی کی تمام تر

پریشانیوں سے آزاد ہوکر ایک پُرسکون ماحول میں اپنے مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوا۔ اس کے علاوہ گھر کے تمام چھوٹے بڑے افراد کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مَیں اپنے ان دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس مقالے کو ضروری اصلاحات سے مزین کیا۔ جن میں ڈاکٹر برکت علی طائر کا نام اہم ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر سورج پرکاش، ڈاکٹر آصف علیمی، ڈاکٹر سُنیل کمار، ڈاکٹر بلبیر سنگھ، ڈاکٹر جاوید مغل، ڈاکٹر الطاف حسین، ڈاکٹر سُکھ دیو، ڈاکٹر اعجاز شاہ، انجنا دیوی، جوتی دیوی، وجے شرما، اعمران شاہ، قیوم ملک، روی راجن، راکیش کمار بڈھوترہ، جسونت سنگھ، جے وردھنے، سنجے کمار شاہ، زلفی رام، ویکرم سنگھ ٹڈیال، محمد عباس وانی، رضا محمود، محمد انور، وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے تحقیقی سفر کے دوران میری ہر ممکن حوصلہ افزائی کی اور جن کی وجہ سے مجھے کبھی بھی تنہاپن کا احساس نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ ان ساتھیوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کا نام یاد نہ آنے کی وجہ سے اس فہرست سے رہ گیا۔

شکریہ

جوگیندر سنگھ

ریسرچ اسکالر شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی، جموں۔

بابِ اوّل

﴿..... جمّوں کشمیر کا اُردو ادب ایک مطالعہ .....﴾

ریاست جمّوں و کشمیر تین صوبوں جمّوں، کشمیر اور لدّاخ پر مشتمل ایک کثیر السانی خِطّہ ہے۔ اِن تینوں صوبوں میں مختلف زبانیں یعنی ڈوگری، کشمیری اور لدّاخی بولی جاتی ہیں جو اِن مذکورہ صوبوں کی بڑی زبانیں ہیں۔ اِن تینوں زبانوں کے علاوہ ریاست کے طول و عرض میں چھوٹی چھوٹی بولیاں رائج ہیں جن میں پنجابی، گوجری، پہاڑی، پوگلی، بلتی، بھدرواہی۔ کشتواڑی، پاڈری، بھلیسی، رامبنی اور سراجی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ریاستی عوام بیک وقت اِن تمام بولیوں میں بات چیت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن ریاست میں عام طور پر عوام کے رابطے کی زبان صرف اُردو ہے جسے ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔

ریاست جمّوں و کشمیر میں اُردو زبان سے قبل سنسکرت اور فارسی جیسی زبانیں رائج تھیں اور ان دونوں زبانوں میں کافی ادبی ذخیرہ بھی مِلتا ہے۔ سنسکرت زبان ریاست میں آریاؤں کی آمد کے ساتھ ہی آتی ہے جو کافی عرصے تک ریاست میں رائج رہی۔ سنسکرت زبان کے بعد یہاں فارسی زبان و ادب کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔

فارسی زبان سیّد بُلبُل شاہ اور اُس کے ہمراہ عقیدت مند مریدوں جو چودھویں صدی عیسوی میں ریاست کے اندر وارد ہوتے ہیں۔ سیّد بُلبُل شاہ اور اُس کے ہمراہ مرید اسلامی تبلیغ کے سلسلے میں تشریف لائے تھے اِن کی زبان فارسی تھی اور وہ تبلیغ کے لئے اس زبان کا استعمال کرتے تھے۔ سید بُلبُل شاہ کی تبلیغ سے لدّاخ کا ایک شہزادہ، جس کا نام ''رنچن شاہ'' تھا جس نے اپنے خاندان کے ساتھ اِسلام قبول کیا۔ رنچن شاہ کا ایک وزیر جو فارسی زبان سے اچھی واقفیت رکھتا تھا وہ بُلبُل شاہ سے دین واِسلام کی باتیں سُن کر یہاں کے عوام کو مقامی زبانوں میں سمجھاتا تھا۔ سید بُلبُل شاہ کے بعد ۱۳۷۲ء میں امیر کبیر سیّد شاہ علی ہمدانی ایران سے اپنے ساتھ مختلف علوم وفنون سے واقفیت رکھنے والے سات سو سادات کے ہمراہ کشمیر تشریف لائے۔ اُن کی زبان بھی فارسی تھی اور وہ اسلامی تبلیغ کے لئے اسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ شاہ ہمدان خود فارسی کے کہنہ مشق شاعر گذرے ہیں۔ لہٰذا کشمیری عوام ان کے فارسی اشعار کو مُتبرک سمجھ کر پڑھتے اور یاد رکھتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ فارسی زبان کشمیر میں سنسکرت زبان کی جگہ لینے لگی۔

ریاست میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ کلامِ پاک کے فارسی ترجمے پڑھنے اور سُننے کا رواج عام ہوتا گیا اس طرح سے ریاست کے تعلیم یافتہ لوگ فارسی پڑھنے، لکھنے

اور بولنے میں بھی ماہر ہونے لگے۔ یہاں تک کہ سُلطان زین العابدین بڈ شاہ کے عہد ۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۰ء میں فارسی علمی و ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ بڈ شاہ نے سینکڑوں سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی زبان میں کروائے۔ بڈ شاہ کے عہدِ حکومت تک آ کر فارسی زبان کشمیر کے تمام تعلیم یافتہ لوگوں کی علمی و ادبی زبان بن گئی۔ عبدالاحد آزاد اِس طرف اِشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''سُلطان زین العابدین بڈ شاہ کے بعد کشمیری زبان کے عروج کی جگہ فارسی زبان نے لے لی۔ فارسی زبان کا عام رواج ہوتے ہی باہر سے کامل فن شعراء یہاں آئے ان کے فیض دائرے سے یہاں بھی فارسی کے بڑے بڑے فنکار پیدا ہوئے بعض فصحا نے تو اپنی قابلیت کے وہ جوہر دکھائے کے اہل زبان تک انگشت بدنداں رہ گے۔'' ۱

ریاست جمّوں و کشمیر میں فارسی زبان و ادب کا چلن اس قدر رہا کہ اہلِ ایران اِسے ایران صغیر کہنے لگے اِس ضمن میں پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب ''کشمیر میں اُردو'' میں لکھتے ہیں:۔

''چودھویں صدی میں ایران اور وسط ایشیا سے آنے

والے علماء کے ساتھ اِسلام اور ایرانی تہذیب کشمیر
پہنچی اور فارسی زبان کو کافی فروغ ہوا۔ ایک زمانے
میں کشمیر پر ایرانی تہذیب کے اثرات اتنے گہرے
ہو گئے تھے اور فارسی زبان میں لکھنے والوں کی اتنی
کثرت تھی کہ اہلِ ایران کشمیر کو اہلِ ایرانِ صغیر کہنے
لگے تھے۔" ۲؎

ریاست میں بالخصوص صوبہ کشمیر میں فارسی کے اثرات کشمیری اور یہاں کی دیگر مقامی بولیوں پر پڑنے لگے اور فارسی زبان بہت تیز رفتاری سے عوام و خواص میں مقبول ہونے لگی۔ شاہ بیری دورِ حکومت تک آتے آتے فارسی زبان یہاں کی سرکاری زبان کا درجہ حاصل کر گئی۔ شاہ بیری اور چک حکومت کے زوال کے بعد جب کشمیر پر مغلوں کا تسلط ہوا تو اکبر اور جہانگیر کے عہد کے نامور فارسی شعراء عرفیؔ، فیضیؔ اور انشا پرداز ابوالفضل کا بھی کشمیر سے براہِ راست تعلق رہا۔ اس طرح کشمیر میں فارسی کے حوالے سے اُردو کی نشو و نما کے لئے زمین ہموار ہوتی رہی لیکن صرف فارسی ہی نہیں عربی زبان نے بھی ریاست میں اُردو کے فروغ میں ایک اہم رول ادا کیا۔ عربی زبان راجہ ہرش کے زمانے سے ہی داخل ہونے لگی تھی پھر چودھویں صدی سے لے کر سولھویں صدی تک کشمیر کی تقریباً

عوام اِسلام کے دائرے میں آ گئی۔ کشمیر میں صوفیا اکرام نے فارسی کے علاوہ عربی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان صوفیا اکرام کی عربی تصنیفات ان کے ترجمے اور شاعری کے حوالے سے کشمیر کی عوام فارسی کے ساتھ ساتھ عربی الفاظ اور تراکیب سے بھی متعارف ہوئی۔ اٹھارویں صدی عیسوی تک آتے آتے ریاست کے لوگوں کی بیرونی ریاست سے آمد و رفت کافی بڑھ گئی۔ اسی صدی میں ریاست پنجاب کے سِکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سِنگھ کے ماتحت آ گئی۔ اس ضمن میں کشمیر کی عوام کا پنجاب کے مختلف شہروں لاہور، جالندھر اور امرتسر میں آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مذکورہ شہر اُردو زبان کے بڑے ادبی مراکز تھے اور ان شہروں کے اکثر شعراء اور اُدباء بھی کشمیر میں آتے جاتے تھے۔ ان شعراء اور اُدباء کی آمد سے ریاست میں اُردو زبان مقبول ہونے لگی۔ اُنیسویں صدی کے وسط میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت پُوری طرح برطانوی حکومت کے زیرِ اثر آ گئی۔ اسی دوران مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۱۸۴۶ء میں برطانوی حکومت سے معاہدہ امرتسر کے مطابق صرف ۷۵ لاکھ روپے کے عوض ریاست جمّوں و کشمیر کو خرید کر یہاں ڈوگرہ راج کی بنیاد قائم کی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں بھی ریاست کی سرکاری، دفاتری اور درباری زبان فارسی ہی رہی۔ جب مہاراجہ گلاب

سنگھ نے سیاسی مصلحتوں اور کاروباری ضرورتوں کے تحت دلی اور لاہور کی حکومت کے ساتھ تعلقات استوار کیے تو تعلیمی، انتظامی اور تجارتی ضرورتوں کے سلسلے میں ریاست کی عوام کا بھی لاہور، دہلی، لکھنؤ، الہ آباد، جالندھر اور امرتسر جیسے بڑے شہروں میں آنا جانا شروع ہوا۔ یہ شہر اُس وقت اُردو کے اہم مراکز ہوا کرتے تھے۔ ان شہروں میں آمد و رفت سے اُردو زبان کے الفاظ، جملے، محاورات اور ضرب المثل کشمیری عوام اپنے ساتھ یہاں لاتی گئی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے دربار سے مختلف علوم وفنون میں مہارت رکھنے والے غیر ریاستی ماہرین اور افسران وابستہ تھے جو اُردو جانتے تھے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ مغل بادشاہوں کے نقشِ قدم پر چلنا باعث فخر سمجھتا تھا۔ اس ضمن میں مہاراجہ نے نہ صرف فارسی کو درباری زبان بنایا بل کہ مغلوں کی رسم ورواج اور تہواروں کو بھی اسی طرح منانا شروع کیا جس طرح مغل مناتے تھے۔ جو میلے مغل سجاتے تھے وہ مہاراجہ کے دور میں یہاں بھی منائے جانے لگے۔ مثلاً نوروز کا تہوار اور پھول والوں کی سیر وغیرہ۔ ان تہواروں اور میلوں میں بیرون ریاست کے فنکار، گانا بجانے والے، رقاص اور بازی گر شریک ہوتے تھے جن کی زبان اُردو ہوتی تھی۔ یہ فنکار یہاں کی عوام سے اُردو زبان میں ہی باتیں کیا کرتے تھے اور یہاں کی عوام کو بھی ان سے تبادلہ خیال میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی تھی۔ چوں کہ یہاں کی عوام عربی اور فارسی زبان بولنے

میں مہارت رکھتی تھی اس لئے انہیں اُردو زبان اپنانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اس ضمن میں ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں:۔

> ''ڈوگرہ عہد میں کچھ عرصہ تک ''نقیبوں'' کو ہندوستان مختلف شہروں سے بلا کر اپنے دربار میں اس غرض کے لیے تعینات کیا گیا تھا کہ وہ ڈوگرہ دربار میں مغلیہ جاہ وجلال کا سا انداز پیدا کریں۔ چنانچہ مہاراجہ دربار میں آتا تھا تو اُس کی آمد کا اعلان مغل بادشاہوں کے انداز سے کیا جاتا تھا، ان نقیبوں کے ساتھ اُن کے پورے پورے خاندان بھی ہوتے تھے جن کی بول چال اُردو تھی۔ اس طرح سے بھی اُردو زبان کا جموں وکشمیر میں عمل دخل شروع ہوا۔'' ۳

مہاراجہ گلاب سنگھ خراب صحت کے سبب ۱۸۵۶ء میں حکومت سے دستبردار ہو گئے تو اُن کے بیٹے مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ۱۸۵۷ء میں حکومت سنبھال لی۔ رنبیر سنگھ کا عہد ۱۸۵۷ء تا ۱۸۸۵ء نسبتاً پُر سکون عہد رہا۔ اس دور میں بھی اگرچہ ریاست کی سرکاری زبان فارسی ہی رہی لیکن اُردو زبان کو اس دور میں کافی ترقی نصیب ہوئی۔ چوں کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ علم دوست حکمران تھے چنانچہ انہوں

نے ریاست میں ایک کالج، ایک لائبریری اور ایک دارالترجمہ قائم کیا۔ رنبیر سنگھ نے انتظامی صورتِ حال کے متعلق جو معلوماتی رپورٹیں تیار کروائیں وہ اُردو زبان میں تھیں۔ ان رپورٹوں کو ریاست میں اُردو زبان کے ابتدائی تحریریں قرار دیا جاسکتا ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے یہ رپورٹیں چودھری شیر سنگھ مہتہ کو کابل، بلخ اور بخارہ کے راستوں کی تفصیلات مہیا کرنے کے لئے سفر پر بھیجا۔ شیر سنگھ نے یہ اپنا سفر نامہ اُردو زبان میں لکھا تھا۔ ڈاکٹر برج پریمی کے مطابق:۔

''چودھری شیر سنگھ مہتہ ۱۸۶۵ء تا ۱۸۶۴ء کے دوران
بخارہ کا سفر کیا۔ واپسی پر اس نے اُردو میں اپنا سفر
نامہ قلم بند کیا یہ ریاست میں سرکاری طور پر پہلی
اُردو تحریر تسلیم کی گئی ہے۔ ایک سو پچاس صفحات پر
مشتمل یہ سفرنامہ بڑا دلچسپ ہے۔'' ۴

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورانِ حکومت میں شیر سنگھ مہتہ نے اس سفر نامے کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں اُردو میں لکھیں جن کے عنوان یوں ہیں۔

(۱)۔''احوال ملک لدّاخ'':۔ یہ کتاب ۱۸۶۹ء میں مکمل ہوئی جس میں لدّاخ کے لوگوں کے سماجی اور تہذیبی حالات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

(۲)۔''ترجمہ بھگوت گیتا''۔

(۳)۔ ''ترجمہ تاریخِ انگلستان''۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں عوام کے لیے رپورٹیں اور معلومات زیادہ تر اُردو زبان میں ہی لکھی جاتی تھیں۔ سرکاری دفاتر میں بھی فارسی کے بجائے اُردو زبان کا استعمال زیادہ کیا جانے لگا تھا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے سرکاری رپورٹیں اور دارالترجمہ سے تیار ہونے والی کُتب کی اشاعت کے لیے ۱۸۸۲ء میں ''بدیا بلاس پریس'' کے نام سے ایک چھاپا خانہ قائم کیا جس میں سنسکرت، عربی و فارسی وغیرہ زبانوں کے تراجم اُردو میں ہوتے تھے۔ اس طرح اس پریس کے قیام سے ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کو کافی فروغ اور ترقی حاصل ہوئی۔ اس عہد میں دیگر زبانوں کی کتابوں کا اُردو زبان میں ترجمہ کرنے اور مسودوں کی تیاری میں مولوی فضل الدین، غلام غوث خان، پنڈت بخشی رام اور لالہ بسنت رائے وغیرہ کے اسمائے گرامی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان حضرات نے تاریخ، مذہب ،علمِ طب ،علمِ منطق ،علمِ الامراض اور انجینیر نگ وغیرہ جیسے موضوعات سے متعلق مسودات کے ترجمے کیے۔ جن کی زبان سادہ اور سلیس ہوتی تھی۔ جس کے نمونے رنبیر لائبریری جمّوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ریاست جمّوں وکشمیر کی عوام کے ادبی ذوق اور اُردو زبان وادب کے تئیں محبت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ''بدیابلاس'' نام کا ایک اخبار جاری کیا جو بیک وقت اُردو اور دیوگری

دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔اس اخبار کی وجہ سے بھی ریاست میں اُردو زبان کوفروغ ملنے میں کافی مدد حاصل رہی۔مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہدِ حکومت میں اگرچہ دفتری کام کاج اُردو اور دیگر زبانوں میں ہوتا تھالیکن فارسی زبان سرکاری زبان کے درجے پر فائز تھی۔ جب مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ۱۸۸۵ءمیں وفات پائی تو اُن کے بیٹے مہاراجہ پرتاب سنگھ تخت نشین ہوئے۔مہاراجہ پرتاپ نے ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو زبان کی مقبولیت اور دفتروں میں اس کے استعمال کومدِ نظر رکھتے ہوئے ۸۹۔۱۸۸۸ءمیں اُردو زبان کو ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد میں اُردو زبان وادب کو بڑا فروغ ملا۔جمّوں وکشمیر کے تمام مذہب کے لوگوں اور بالخصوص تین خطوں ''جمّوں، کشمیر اور لدّاخ'' کے رابطے کی اورعلمی وادبی اظہار کی زبان اُردو بنی۔جب مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے سرکاری سرپرستی میں ''سناتن دھرم سبھا'' قائم کی تو اس کے تحت عیسائیت کی تبلیغ کا جواب دینے کے لئے کئی کتابچے اُردو زبان میں ہی تحریر کیے گئے۔ یہ کتابچے سالگ رام سالکؔ نے لکھے تھے۔ان کتابچوں کے علاوہ سالگ رام سالکؔ نے کئی اور کتابیں اُردو میں لکھیں جن کا ذکر مورخین نے ریاست کی تاریخی وادبی کتابوں میں کیا ہے۔سالگ رام سالک کی چند اہم اور مشہور تصنیفات کے عنوان درجہ ذیل ہیں:۔

(۱)۔ ''ارتھ شاشتر''۔

(۲)۔ ''مورتی منڈن''۔

(۳)۔ ''دھرم اُبدیش''۔

(۴)۔ ''داستان جگت روپ'' اور

(۶)۔ ''محاورات اُردو''۔

سالگ رام سالکؔ کے بڑے بھائی پنڈت ہرگوپال کول خستہؔ کشمیر سے ہجرت کر کے لاہور چلے گئے تھے وہاں انہوں نے ریاست جمّوں وکشمیر کے تاریخی حالات، جغرافیائی محل وقوع، کشمیری عوام اور اُن کے رسم ورواج کے متعلق ایک کتاب بعنوان ''گلدستۂ کشمیر'' لکھی جو ۱۸۷۷ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ پروفیسر قدوس جاوید نے اپنے ایک مضمون میں ہرگوپال کول خستہؔ کی اس کتاب ''گلدستۂ کشمیر'' کو ریاست جمّوں وکشمیر کی پہلی باضابطہ نثری تصنیف قرار دیا ہے۔ اس مذکورہ کتاب میں ابتداء سے لے کر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہدِ حکومت تک کی ریاست جمّوں وکشمیر کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ پنڈت ہرگوپال کول خستہؔ نے ''گلدستۂ کشمیر'' کے علاوہ ''گلزارِفوائد'' کے نام سے ایک قصّہ بھی لکھا ہے جس میں ڈپٹی نذیر احمد کے پہلے ناول ''معراۃ العروس'' ۱۸۶۹ء کا تبلیغ کیا گیا ہے۔ اس قصّے کی زبان اُن کی تاریخی کتاب ''گلدستۂ کشمیر'' سے زیادہ صاف، سلیس اور رواں ہے۔

اُنیسویں صدی کے آخر تک آتے آتے اُردو زبان ریاست جمّوں وکشمیر میں رابطے کے ساتھ ساتھ علمی وادبی زبان بن چکی تھی ۔ ڈوگرہ عہدِ حکومت میں پریس قائم کرنے اور اخبار و سائل جاری کرنے کی سخت پابندی عائد تھی۔ ریاست جمّوں وکشمیر کے اُردو داں ، صحافی ، ادیب ریاست سے باہر "لاہور"، "پنجاب"، "جالندھر"، "امرتسر" اور دیگر شہروں سے جو اخبارات ورسائل شائع کرتے تھے ان میں بہارِ کشمیر، صبح کشمیر، خیر خواہ کشمیر، کشمیری گزٹ ، اخبارِ عام ، کشمیری مگزین اور کشمیری مخزن وغیرہ شامل ہیں ۔ان مذکورہ بالا اخبارات ورسائل نے ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کو فروغ دینے میں جو رول ادا کیا ہے وہ نہ قابلِ فراموش ہے۔ ریاستی عوام بیرون ریاست سے شائع ہونے والے ان اخبارات ورسائل کو بڑے ذوق وشوق سے خریدتی اور پڑھتی تھی ۔ دراصل ان اخبارات ورسائل کو خریدنے اور پڑھنے کی بڑی تعداد ریاستی عوام کی ہی ہوتی تھی ۔ بیسویں صدی میں جب ڈوگرہ حکومت نے اخبار جاری کرنے کی اجازت دی تو ریاست سے پہلا اخبار بعنوان "رنبیر" ۲۴ جون ۱۹۲۴ء کو جمّوں سے شائع ہوا۔اس اخبار کے اڈیٹر ملک راج صراف تھے۔اس اخبار کی اشاعت کے ساتھ ہی کشمیر سے "وتستا"، "ہمدرد"، "صداقت"، "وکیل"، "حقیقت"، "خدمت" اور "خالد" وغیرہ متعدد اخبارات شائع ہونے لگے ۔ ان اخبارات میں

ریاستی، ملکی اور غیر ملکی خبروں کے علاوہ ریاست جموّں وکشمیر کے نامور ادیبوں وشاعروں کی ادبی تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں۔ ریاست سے شائع ہونے والے ان مذکورہ اخبارات نے اُردوزبان وادب کو ریاستی عوام کے زیادہ قریب کردیا۔ ریاستی عوام میں ادبی ذوق وشوق بڑھانے میں ان اخبارات نے اہم کردارادا کیا ہے۔ آزادی کے بعد ریاست سے متعدد اخبارات ورسائل جاری ہوئے جن میں ''شیرازہ''، ''حکیم الامت''، ''تفہیم''، ''تعمیر'' اور ''بزمِ ادب'' وغیرہ شامل ہیں ان کے علاوہ کشمیر عظمیٰ، اُڑان، تسکین، ہندوستان چٹان، اذانِ سحر، سرینگر ٹائمز کے علاوہ اور کئی درجن روزنامے اور ہفتہ وار اخبارات شائع ہورہے ہیں۔ ان اخبارات میں ریاست جموّں وکشمیر کے ادیبوں وشاعروں کی ادبی تخلیقات، تحقیقی وتنقیدی مضامین اور کالم وغیرہ شائع ہوتے ہیں۔

اُردوزبان ریاست کی سرکاری، درباری، دفتری اور کاروباری زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ تعلیمی اعتبار سے بھی اس زبان کو ریاست میں اوّلیت حاصل ہے۔ پوری ریاست کے تقریباً تمام اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اُردو تعلیم کے اعلیٰ انتظامات ہیں۔ ریاست جموّں وکشمیر کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں اور ٹیلی ویژن سے اُردوزبان میں خبریں اور دیگر پروگرام کروائے جاتے ہیں۔

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو اُردو زبان وادب نے ریاست جمّوں وکشمیر میں ڈیڑھ سو برس میں اتنی ترقی کر لی ہے جتنی برصغیر ہند و پاک کے دوسرے ادبی مراکز دہلی، کراچی، لاہو، لکھنئو، حیدرآباد، علی گڑھ، اسلامہ آباد وغیرہ میں اُردو زبان وادب نے کم وبیش ایک ہزار سال میں کی تھی۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ریاست میں اُردو زبان وادب کے ارتقاء کے لیے ہندو پاک کے تمام علمی وادبی مراکز اور تعلیمی اداروں میں اُردو زبان کی ساخت، اسالیب، اصناف، مزاج اور معیار سے یہاں کے شعراء واُدباء نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا یعنی ہندو پاک کے اہم اور بڑے مراکز جس سے ریاست جمّوں وکشمیر کی عوام کا برائے راست تعلق رہا وہاں اُردو زبان پورے طور پر ترقی کر چکی تھی اس لیے ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کے فروغ وارتقاء کی رفتار شروع سے ہی تیز رہی۔ اگر چہ ریاست میں اُردو کو بعض مسائل کا سامنا ضروری رہا ہے لیکن جدید دور میں اُردو زبان وادب کی جڑیں اس ریاست میں اتنی مضبوط ہو چکی ہیں کہ ریاست میں اُردو کا مستقبل شاندار اور محفوظ نظر آتا ہے۔ یہاں کے تمام تعلیمی اداروں بعض اہم دفتری کاروباری نظام میں اُردو زبان کا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو شاعری کا آغاز یہاں کے فارسی شناس شعراء کے ہاتھوں ہوا جو مغل دربار سے وابستہ تھے اور ان میں رسؔوا، قبولؔ، ملا محسن فانیؔ اور حشمتؔ

وغیرہ کے نام شامل ہیں وہیں دوسری طرف ریاست کی سرزمین پر رہ کر جن شعراءو اُدبا نے اُردو شعروادب کی داغ بیل ڈالی اُن میں شیخ غلام محی الدین میر پوری کو خاص مقام حاصل ہے۔ ان کی مثنوی ''گلزارِ فقیر'' جو ۱۷۷۱ء میں تصنیف ہوئی تھی ریاست کی پہلی شعری تخلیق مانی جاتی ہے اور نثر کے حوالے سے لالہ بوٹامل، پنڈت ہرگوپال خستہ اور چودھری شیر سنگھ کی نثری تحریروں کو ریاست جمّوں وکشمیر کے اوّلین نثری نمونے قرار دئے جاتے ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ تعلیم یافتہ اور علم دوست مہاراجہ تھے اور وہ اُردو زبان وادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے وہ جمّوں وکشمیر کی عوام کو بھی تعلیم یافتہ اور جدید علوم وفنون سے آشنا کروانے کے خواہش مند تھے۔ وہ فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کی علمی وادبی سرگرمیوں سے بھی واقف تھے اس لیے اُن کے عہد میں اُردو زبان وادب نے کافی ترقی کی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کا وزیر دیوان کرپارام کئی کتابوں کا مُصنف تھا وہ فارسی وانگریزی کے علاوہ اُردو زبان میں بھی خاص مہارت رکھتا تھا۔ اُس نے ریاست کے انتظامی صورتِ حال کے بارے میں زیادہ تر اُردو میں رپورٹیں تیار کروائیں۔ ان رپورٹوں کو ریاست جمّوں وکشمیر کے ابتدائی نثری نمونے تصوّر کیا جاتا ہے۔ لیکن جدید تحقیق کے مطابق مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں بوٹا سنگھ نامی ایک شخص نے چائے کی کاشت کے بارے میں ایک رسالہ ۱۸۵۷ء میں اُردو زبان میں لکھا تھا جو اُردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دی جاسکتی ہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے کتابوں اور رپوٹوں کی اشاعت کے لیے ۱۸۸۲ء میں ''بدیابلاس'' کے نام سے ایک پریس بھی قائم کیا اور اسی پریس کے نام سے پہلا اخبار بھی جاری ہوا۔ اخبار کا اِجزا اُردو کی ترقی اور ترویج کی طرف ایک مثبت قدم تھا۔ یہ اخبار ہندی اور اُردو میں نکلتا تھا۔ اس کے علاوہ سنسکرت اور فارسی کی اعلیٰ کتابوں کے ترجمے بھی اُردو زبان میں کیے گئے۔ اس مذکورہ پریس نے اُردو زبان و ادب کے فروغ و ارتقاء میں جو کردار نبھایا ہے وہ نا قابلِ فراموش ہے۔ رنبیر سنگھ کے عہد کے کئی مسودات رنبیر لائبریری جمّوں میں موجود ہیں۔ اس حقیقت سے سب واقف ہیں کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد تک اُردو زبان ریاست جمّوں و کشمیر کی عوامی زبان کی حیثیت حاصل کر چکی تھی۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے تخت نشین ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ بھی عطا کیا۔ پرتاپ سنگھ کے عہد کے اُردو ادیبوں میں پنڈت ہرگوپال کول خستہؔ کا نام سرِ فہرست ہے۔ خستہؔ کشمیر الاصل تھے وہ تعلیم کے سلسِلے میں ہندوستان کے مختلف شہروں میں تعینات رہے اس لیے انہیں ہندوستان کے نامور شعراء واُدبا سے ملنے کا شغف حاصل رہا جن کے اثرات خستہؔ کی تخلیقات پر نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے جو اُردو تخلیقات شائع کی ہیں اُن کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ ہرگوپال خستہؔ ریاست جمّوں و کشمیر کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے ریاستی نثری

سرمایہ میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ ان کے نثری کارناموں میں تنقیدی و تحقیقی مضامین، تاریخِ کشمیر، انشائیے اور دیگر قصّے شامل ہیں۔ خستہؔ ایک طویل عرصہ تک ملازمت کے سلسلے میں لاہور میں قیام پذیر رہے۔ انہوں نے دورانِ ملازمت لاہور میں ہی رہ کر اُردو کے متعدد اخبارات و رسائل جاری کئے جن میں ''ریفارمر''، دیش کی پکار'' اور ''خیرخواہ کشمیر'' وغیرہ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ریاست جمّوں و کشمیر میں اُردو نثر کے حوالے سے ابتدائی دور میں ہرگوپال خستہؔ کے بعد ان کے چھوٹے بھائی پنڈت سالگ رام سالکؔ کا نام بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ سالگ رام سالکؔ بھی لاہور میں قیام پذیر رہے۔ وہ بھی ''خیرخواہ کشمیر''، ''اُودھ اخبار'' اور اس دور میں شائع ہونے والے دیگر نامور اخبارات و رسائل میں اپنے مضامین شائع کرواتے تھے جو زیادہ تر تحقیقی و تنقیدی نوعیت کے ہوتے تھے۔ ان مضامین کے علاوہ سالگ رام سالکؔ نے ایک قصّہ ''داستانِ جگت روپ'' لکھا جسے کچھ مُحققوں نے ریاست جمّوں و کشمیر کا پہلا اُردو ناول قرار دیا ہے۔ ''گنجینۂ فطرت''، ''تحفۂ سالک'' اور ''رنبیر پینل کوڈ'' ان کی دیگر اہم تخلیقات ہیں۔ ''تحفۂ سالک'' سفرنامہ ہے اور ''رنبیر پینل کوڈ'' قانون تعزیراتِ جمّوں و کشمیر پر مبنی ان کی ایک مقبول اور یادگار تصنیف ہے۔

اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوّل میں ریاست جمّوں و کشمیر کے

نامور شعراء واُدباء کی تخلیقات لکھنو، امرتسر، الہ آباد اور لاہور سے جاری ہونے والے اخبارات میں شائع ہوتی تھیں۔ ریاست کے شعراء واُدباء کی تخلیقات کے علاوہ ریاست کے حالات اور سیاسی افراتفری کے متعلق خبریں بھی لاہور سے جاری ہونے والے اخبارات میں مسلسل شائع ہوتی تھیں۔ اس سلسلے میں مولانا غلام رسول مہرؔ، عبدالمجید سالک کا اخبار ''انقلاب'' خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے۔ روزنامہ ''انقلاب'' لاہور سے جاری ہونے والا ایک ایسا اخبار تھا جس میں زیادہ تر ریاست جمّوں وکشمیر کے بگڑتے حالات وواقعات کی خبریں چھپتی تھیں۔ یہ اخبار غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک نے ۱۹۲۷ء میں لاہور سے جاری کیا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ اور ان کے دیگر رفقاء نے آزادی کی تحریک شروع کی تو مذکورہ اخبارات کے زیادہ تر صفحات کشمیر کی آزادی کی تحریک کی جدوجہد، سیاسی افراتفری اور ڈوگرہ راج کی من مانیوں کو پیش کرنے میں وقف رہنے لگے۔ آخر کار انگریزی حکومت نے اس اخبار کے مدیر کو تنگ کرنا شروع کر دیا اور پانچ ہزار کی ضمانت طلب کر کے ریاست میں اس اخبار کا داخلہ بند کر دیا۔ اس اخبار پر لگی پابندی کے بعد ادارتِ انقلاب نے ''مظلوم''، ''مکتوبِ کشمیر'' اور ''مظلوم کشمیری'' کے نام سے اخبار نکالے۔ مذکورہ اخبارات میں بھی روزنامہ ''انقلاب'' کی طرح ریاست جمّوں وکشمیر کے سیاسی حالات کے بارے میں خبریں شائع ہونے لگیں۔ ان

اخبارات پر بھی ڈوگرہ حکومت نے پابندیاں عائد کر دیں ۔ ان اخبارات میں ریاست جمّوں وکشمیر کے بہت سارے شاعروں اور نثر نگاروں کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی تھیں ۔

جمّوں وکشمیر کے ادیب، تاریخ نویس اور شاعر محمد دین فوقؔ نے ریاستی ادب میں اپنی بیش بہا تخلیقات سے جو اضافہ کیا ہے اُسے ریاستی ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا ۔ فوقؔ بیک وقت تاریخ نگار، ناول نگار، افسانہ نگار اور شاعر تھے لیکن ان کی شہرت ومقبولیت کا باعث ان کی تاریخ نگاری ہے ۔ محمد دین فوقؔ کی تصنیفات لگ بھگ چالیس کے قریب ہیں ۔ ان کی چند اہم تصنیفات کے عنوان یوں ہیں ''تاریخ اقوام کشمیر''، ''تاریخ اقوام جمّوں''، ''تاریخ اقوام پونچھ''، ''شباب کشمیر''، ''تاریخ بڈشاہی''، ''کشمیر کی رانیاں''، ''تاریخ کا روشن پہلو''، ''تاریخ حریت اسلام کے نام'' قابل فراموش واقعات''، ''اکبر''، ''ناکام'' ''انارکلی''، ''ناصحِ مشفق''، ''غریب الدیار''، ''خواتین کشمیر'' اور ''شعری مجموعہ کلامِ فوقؔ'' وغیرہ ۔ فوقؔ کی تخلیقات میں زیادہ تر تاریخی تصانیف شامل ہیں ۔ انہوں نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورانِ حکومت میں اخبار جاری کرنے کی اجازت کئی بار طلب کی لیکن انہیں ریاست سے اخبار جاری کرنے کی اجازت نہیں ملی ۔ پھر محمد دین فوقؔ نے ''کشمیری'' نام کا ایک اخبار لاہور سے جاری کیا ۔ اس اخبار میں محمد دین فوقؔ خود بھی لکھتے تھے

اور دوسروں سے بھی لکھواتے تھے۔ اس مذکورہ اخبار میں اُردو ادب کے نامور شاعر و فلسفی علامہ اقبالؔ کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ فوقؔ کی صحافتی خدمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور کشمیر کے عظیم شاعر مہجورؔ نے اپنی اُردو تصنیف ''حیاتِ رحیم'' میں فوقؔ کے متعلق یوں لکھتے ہیں:۔

''فوقؔ کا نام کشمیر کی جدید تاریخ میں مورخ آب زر
سے لکھیں گے جس نے صد ہا میل اپنے وطن
''قدیم کشمیر'' سے دور رہ کر اپنے پس ماندہ اہلِ خطّہ
بھائیوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور
اس خطّہ مہر پر منجمد اور ساکن خون کو حرکت و حرارت
میں لانے کے لیے اخبار ''کشمیر'' جاری کیا۔'' ۵

محمد یوسف ٹینگ مہجورؔ کی مشہور نثری تصنیف ''حیاتِ رحیم'' کو ریاست جموں و کشمیر کی پہلی اُردو نثری تخلیق قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''ہرگوپال خستہؔ کی تصنیف ''گلدستۂ کشمیر'' کو اس لحاظ
سے پہلی اُردو کتاب تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ خستہؔ
نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ پٹیالہ میں بسر کیا تھا۔ پھر
وہ کشمیری زبان بے ساختگی سے بولنے کا بھی محمل

نہیں تھا۔اس طرح فوقؔ اگرچہ کشمیری تھے لیکن ان
کی پیدائش پنجاب میں ہوئی تھی۔وہ بھی بعض روایات
کے مطابق کشمیری زبان بولنے کی اہلیت سے محروم
تھے۔لہٰذا مہجورؔ کو یہ سعادت نصیب ہوئی وہ وطن عزیز
کا پہلا فرزند تھا جس نے ایک مکمل اور مدلل اُردو
کتاب تحریر کی۔'' ۶

ریاست جمّوں وکشمیر میں غیر افسانوی اُردو نثر کے حوالے سے بیسویں صدی کے اوئل میں ایک اہم نام کشمیر کے مشہور ومعروف شاعر غلام احمد مہجور کا ہے۔مہجور نے ۱۹۲۲ء میں ۱۲۸ صفحات پر مشتمل صفایور کے ایک نامور بُزرگ دلی رحیم قلندر کی سوانح عمری ''حیات رحیم'' لکھی۔''تذکرہ شعرائے کشمیر'' مہجورؔ کا ایک اہم نثری کارنامہ ہے لیکن یہ تذکرہ کسی وجہ سے شائع نہ ہوسکا۔مہجورؔ کے پوتے ابدال مہجورؔ کے پاس اس تذکرے کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ابدال مہجورؔ کے مطابق اس تذکرے میں چار سودس صفحات ہیں اور اس میں کشمیری شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱)۔ایک ہزار ہجری تک کے شعراء کا دور۔

(۲)۔۱۰۰۰ء سے ۱۲۲۹ء تک کے شعراء کا دور۔

(۳)۔۱۲۳۰ء سے ۱۳۱۳ء تک کے شعراء کا دور۔

مہجوؔر کا ایک اور مختصر اُردو مسودہ ''آ ئینہ اتحاد'' بھی ہے جس میں بیسویں صدی کے اوائل میں ریاست جمّوں وکشمیر کے بعض علاقوں میں پیدا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کی مذمت کی گئی ہے۔اس کے علاوہ مہجوؔر نے کلام شیخ نورالدین رشی کا مسودہ بھی تیار کیا ہے۔اس مسودے کی ابتدامیں مہجوؔر نے لکھا ہے:۔

''خدا کا شکر ہے کہ راقم الحروف کو خدا نے شیخ نورالدین ریشی
کے کلام کو جمع کرنے کی توفیق بخشی اور آج مورخہ اوّل ماگھ
۲۰۱۸ھ مسودہ مکمل کرتا ہوں۔'' ؎

مہجوؔر نے ''سفرنامہ لدّاخ'' کے نام سے ایک مسودہ تیار کیا تھا۔اُردو زبان وادب کے محقق ونقاد محمد یوسف ٹینگ نے اپنی کتاب ''مہجور شناسی'' میں لکھا ہے کہ یہ سفرنامہ لدّاخ اور کرگل کے ۱۹۱۹ء کے بندوبست سے متعلق ہے۔جان محمد آزاد کے مطابق مہجوؔر نے ''پٹواری'' نام کا ایک کتابچہ بھی لکھا تھا۔ایک ناول ''عزیز'' بھی رقم کیا تھا۔ ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کے فروغ وارتقاء میں مہجوؔر کا نام سرِفہرست ہے۔

اُردو نثر کے حوالے سے ریاست جمّوں وکشمیر میں ایک اور نام شورش کاشمیری کا ہے۔شورش بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن تحریکِ آزادی کشمیر کے متعلق اُنہوں نے مختلف اخباروں میں کام کیا اور بہت ساری نظمیں کشمیر کے متعلق لکھیں۔شیخ محمد عبداللہ نے

اپنی سوانح عمری ''آتش چنار'' میں شورش کاشمیری کو بڑی عقیدت سے یاد کیا ہے۔

تقسیمِ ہند سے قبل جمّوں میں جن شعراء واُدباء نے اُردو زبان وادب کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے ان میں پروفیسر نند کول طالبؔ، راما نند ساگر، پریم ناتھ پردیسی، محمد دین فوقؔ، شہ زور کاشمیری، پریم ناتھ درؔ، کنول نین پرواز، غلام رسول نازکیؔ، رساؔ جاودانی، محمد نور عمر الٰہی، غ۔م۔طاؤسؔ اور کئی دیگر شعراء واُدباء نے اُردو زبان وادب کو اپنی گراں قدر تخلیقات سے نوازا۔ تقسیمِ ہند کے بعد ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کے فروغ وارتقاء میں شمیم احمد شمیمؔ، حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، اکبر حیدری، اکبر لداخی، پشکر ناتھ، تیج بہادر بھان وغیرہ کے نام کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

عصرِ حاضر میں ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کو جلا بخشنے میں حکیم منظور، ہمدم کاشمیری، پرت پال سنگھ بیتابؔ، آنند لہر، خالد حسین۔نور شاہ، بلراج بخشی، وریندر پٹواری، محمد زماں آزردہ، پروفیسر قدوس جاوید، ریاض پنجابی، ترنم ریاضؔ، عرش صہبائیؔ، حسام الدین بیتاب، سیفی سوپوری، صوفی غلام محمد، روبینہ میر، فاروق مضفر، احمد شناش، پریمی رومانی، خالد بشیر، اسیرؔ کشتواڑی عاصیؔ، محمود الحسن محمود، ایس اے ساگر، تنویر احمد خطیب، پروفیسر ظہور الدین، نصرت آرا چودھری، پروفیسر شہاب عنایت ملک، پروفیسر اسد اللہ وانی، شہباز راجوری، امین بانہالی اور پروفیسر ملک محمد

آصف ملک علیمی کے علاوہ سینکڑوں نومشق شعراء واُدبا کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کا باقائدہ آغاز ڈوگرہ عہدِ حکومت میں ہوتا ہے۔دراصل کشمیر میں اُردو زبان کی تشکیل کا عمل اس ریاست میں بیرون ریاست و ملک سے آنے والے فارسی اور عربی داں اوّلیا اکرام کی آمد کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے۔ڈوگرہ حکومت کے وجود میں آنے کے بعد اُردو میں شعری ونثری تخلیقات کی پیش کش کا باضابطہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔۱۸۸۹ء میں اُردو زبان کی مقبولیت اور عوامی دلچسپی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔اس کے بعد ریاست جمّوں وکشمیر کے متعدد شاعروں ،نثر نگاروں ،نقادوں اور محققوں نے اُردو زبان وادب کو اپنی بیش بہا تخلیقات کی بدولت اس قابل بنا دیا کہ برصغیر ہند و پاک کے اُردو زبان وادب کے اہم مراکز ،لاہور، لکھنو، عظیم آباد، دہلی، علی گڑھ، کراچی، حیدرآباد اور اسلامہ آباد کے مدِ مقابل اس ریاست کو مانا جاتا ہے۔

﴿☆ ☆ ☆﴾

حواشی

۱۔ عبدالاحد، ''کشمیری زبان وشاعری''، حصہ اوّل، ۱۹۸۲ء، ص ۴۰۔

۲۔ پروفیسر عبدالقادر، ''کشمیر میں اُردو''، ۱۹۹۳ء، ص ۱۹۔

۳۔ ڈاکٹر برج پریمی، ''جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشونما'' ۲۰۱۳ء، ص ۱۸۔

۴۔ ڈاکٹر برج پریمی، ''جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشونما'' ۲۰۱۳ء، ص ۲۰۔

۵۔ مہجورؔ، ''حیاتِ رحیم''، ۱۹۲۲ء، ص ۹۔

۶۔ محمد یوسف ٹینگ، ''مہجورؔ شناسی''، ۱۹۸۷ء، ص ۲۹۔

۷۔ مہجورؔ، ''آئینہ آغاز''، ص ۱۹۔

..... ☆ ☆ ☆ ☆ .....

باب دوئم

﴿.. جمّوں وکشمیر کی اُردو شاعری پر ترقی پسند تحریک کے اثرات ..﴾

ریاست جمّوں وکشمیر کی شاعری میں ترقی پسند تحریک کے اثرات انجمن ترقی مُصنفین کے قیام کے ساتھ ہی نمایاں ہونے لگے تھے کیوں کہ اس دور میں ریاست جمّوں وکشمیر جن سیاسی ، سماجی اور معاشی مسائل سے دوچار تھی وہ ملک کے دوسرے حصّوں سے زیادہ سنگین تھے۔ اسی لئے بیسویں صدی کے آغاز سے ہی ریاستی عوام علامہ اقبالؔ اور پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفیؔ وغیرہ کی انقلابی شاعری سے متاثر تھے اور ترقی پسند تحریک کے اغراض ومقاصد میں ریاست کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی اپنے سماج کے مسائل کے حل کی صورتیں نظر آنے لگیں ۔ اور پھر آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی ایک عرصہ تک ریاست میں ترقی پسند شاعری اور افسانوی ادب کی دھوم رہی اور آج بھی اُردو شاعری میں ترقی پسند عناصر جدید نسل کے شاعروں میں یہاں کثرت سے مل جاتے ہیں۔ لیکن ترقی پسندی کیا ہے اور ریاست جمّوں وکشمیر میں ترقی پسند شاعری کا

پس منظر کیسا رہا ہے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

اُردو شاعری کا مطالعہ ہم روایتی یا کلاسیکی ، عشقیہ یا صوفیانہ ، ترقی پسند یا جدید کسی بھی عنوان سے کیوں نہ کریں اُن امتیازات اور خصائص کی نشاندہی ضروری ہے جن کی وجہ سے ہم شاعری کو کسی مخصوص دائرے میں رکھتے ہیں ۔ ترقی پسند شاعری واضح طور پر نظریاتی شاعری ہے ۔ لیکن شاعری نظریاتی ہو یا احساساتی اگر شاعری کے فنّی ، لسانی اور جمالیاتی تقاضوں کے مطابق سامنے آتی ہے تو شاعری ہے ۔ ورنہ صرف کسی نظریہ یا احساس کے راست اور عامیانہ اظہار کو شاعری کا نام نہیں دیا جاسکتا ۔ شاعری میں اگر نظریہ اور شعری تقاضوں کو توازن و تناسب کے ساتھ برتا جائے تبھی وہ شاعری نظریاتی ہونے کے باوجود شاعری بھی کہلانے کی حق دار ہو گی ۔ لیکن چوں کہ نظریہ کی معنویت اور شاعری کی حُرمت کو توازن کے ساتھ برتنا آسان نہیں اس کے لئے نظریاتی پختگی کے ساتھ شاعرانہ مہارت کا ہونا بھی ضروری ہے ۔ ورنہ شاعری یا تو محض پروپیگنڈہ ہو کر رہ جائے گی یا پھر شاعری میں نظریہ کہیں گم ہو کر رہ جائے گا ۔ اسی لئے ہر دور میں شعروادب میں تعمیری یا اصلاحی مقصد اور نظریہ کو سامنے رکھا تو گیا ہے لیکن شعروادب کے تقاضوں کا بھی بہر حال لحاظ رکھا گیا ہے ۔

کسی بھی زبان کی شاعری ہر زمانے میں اپنا مواد معاشرہ سے ہی

حاصل کرتی ہے اور اسے تخلیقی لوازمات سے آراستہ کر کے، کسی مخصوص ادبی صنف کی شکل میں معاشرے کو ہی لوٹا دیتی ہے۔لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کوئی بھی زندہ صنف وقت اور زمانے میں رونماں ہونے والی تبدیلیوں کو اپنے ساتھ لے کر ہی چلتی ہے۔اس لئے اگر چہ ہر ادبی رویہ یا رُجحان میں وقت اور زمانے کے ساتھ تبدیلی آتی ہے لیکن چوں کہ شاعری کا بنیادی کردار انسان ہی ہوتا ہے اس لئے شاعری بھی سادگی کے ساتھ یا استعارتی انداز میں نظریہ کے ساتھ یا آزادانہ طور پر انسان اور انسانیت کو ہی مرکز میں رکھتی ہے۔ مارکسی جمالیات بھی یہی کہتی ہے، نئے مارکسی ناقدین جارج لوکاج اور ٹیری الکٹن اور اُردو کے مشہور شعراء وادباء سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، فیض احمد فیضؔ اور سردار جعفریؔ شاعری میں محض نعرہ بازی کی مخالفت کرتے ہیں۔اسی لئے تمام بڑے اور منفرد ترقی پسند شاعروں کی شاعری کی یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی بنا پر شعروادب کو زندگی کا عکاس اور ترجمان کہا جاتا ہے۔ چناں چہ ہر ادبی نظریہ چاہے اسے جو بھی نام دیا جائے بنیادی طور پر اس کی جڑیں اپنے معاشرہ اور اپنی ثقافت میں ہی پیوست ہوتی ہیں۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی ادیب خواہ جتنی بھی کوشش کیوں نہ کرے وہ اپنے معاشرے اور اپنی ثقافت کی روایات اور تقاضوں کی ہی رو سے لکھے گا اب یہ الگ مسئلہ ہے کہ وہ معاشرے اور ثقافت

کو کس نظر سے دیکھتا اور پرکھتا ہے اور ادب کے حوالے سے معاشرے اور ثقافت کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ لیکن کسی ادیب کا نظریہ، ادب اور معاشرہ میں ہلچل نہ پیدا کر سکے اصلاح، ترقی اور تعمیر کے امکانات کو روشن نہ کر سکے تو اس ادیب کا نظریہ اس ادیب کی ذات تک سمٹ کر رہ جاتا ہے اور اس کا ادب، دوسرے ادیبوں اور ادب کا ذوق رکھنے والے قارئین کو زیادہ متاثر نہیں کر پاتا۔ دراصل ہر نیا ادبی نظریہ ایک نئے خودرُو پودے کی طرح ہوتا ہے جس کی نشو و نما اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اسے دوسرے ادیبوں اور قارئین کی جانب سے قبولیت اور پسندیدگی کی آب و ہوا نہ ملے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب نئے نظریئے میں خود بھی زبان، اسلوب اور فکر و خیال کیا اعتبار سے جدّت و نُدرت اور اثر آفرینی کی قوت موجودہ ہو۔ اُردو ادب میں متعدد نظریات بڑے طمطراق کے ساتھ سامنے آئے لیکن ادب کو زیادہ متاثر نہ کر سکے۔ اور ادب پر دیرپا اثرات مرتب کئے بغیر ہی محض تاریخ کا حصّہ ہو کر رہ گئے۔ اس کے برعکس جن نظریات میں تازگی توانائی اور اجتہاد کی قوت موجودہ تھی وہ نظریات نہ صرف مقبول ہوئے بل کہ ہم عصر اور بعد میں آنے والے ادیبوں نے بھی انھیں اپنایا اور آگے بڑھایا۔ اسی لئے یہ نظریات ادب کی ترقی اور توسیع کا باعث بنے۔ اس ضمن میں سرسیّد اور حالؔی کا نظریہ ادب، اقبالؔ کا نظریہ ادب،

ترقی پسند نظریہ ادب ،فرائڈ کا نظریہ ادب ، جدیدیت کا نظریہ ادب اور مابعد جدیدیت کا تصورادب وغیرہ اہم ہیں۔

اُردو میں ترقی پسندی کا آغاز کس نے کیا اس کے بارے میں اختلاف رائے ہے لیکن ، سجاد ظہیر کی تصنیف ''روشنائی''اور سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسندادب''اور دیگر کتب ومضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو میں ترقی پسند شعروادب کی تخلیق کا سلسلہ ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مُصنفین کے قیام سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ترقی پسند افسانوں کا مشہور زمانہ مجموعہ ''انگارے'' ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا ۔اسی طرح ترقی پسند شاعری کے اوّلین نمونے بھی تیسری دہائی کے آغاز میں ہی ملتے ہیں۔کمال احمد صدیقی کے مطابق اُردو میں ترقی پسند شاعری کی باضابطہ ابتدا اسرارالحق مجاز کی نظم ''نغمہ ٹیگور'' سے ہوتی ہے۔

مجاز کے بعد سردار جعفری ، کیفی اعظمی پرویز شاہدی ، مخدوم محی الدین ، احسان دانش ، وامق جونپوری اور سلام مچھلی شہری فارغ، مجروح سلطان پوری،فیض احمد فیض ، جوش ملیح آبادی ،اختر الامان ، جان نثار اختر ،معین حسن جذبی ،ساحر لدھیانوی ،احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے ترقی پسند شاعری کو آگے بڑھایا۔

دراصل یہی وہ ترقی پسند شاعر ہیں جن سے ریاست جمّوں کشمیر کے اُردو شاعروں نے اثرات قبول کیے۔ ریاست جمّوں کشمیر میں ترقی پسند شاعری کے باضابطہ اثرات ۱۹۴۰ء کے آس پاس نمایاں ہوتے ہیں۔ چوں کہ یہ زمانہ تحریکِ آزادی کا زمانہ تھا، ساتھ ہی ساتھ انجمن ترقی پسند مُصنفین سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں نے ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں جو پہلی کانفرس کی تھی اور دوسرے ترقی پسند دانشوروں کی تقریروں کے علاوہ خاص طور پر پریم چند نے ادب کی غرض و غایت کے عنوان سے اپنے صدراتی خطبہ میں حسن کا معیار اور ادب کا مزاج بدلنے کی جو باتیں کہیں تھیں اُس کا اثر پورے ملک کے شعر و ادب اور شاعروں و ادیبوں پر پڑا۔ چناچہ پریم ناتھ پردیسی، نند لال کول طالبؔ، ولی رام والی، مہندر رینا، مہجورؔ کشمیری اور رسؔا جاودانی سے لے کر غلام رسول نازکیؔ، غ۔ م طاؤسؔ، اور بلبلؔ کاشمیری وغیرہ نے ایسی شاعری کی جنہیں ہم ترقی پسند شاعری کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔

جمّوں وکشمیر کی اُردو شاعری پر ترقی پسند تحریک کے اثرات صرف مارکسی فلسفہ کے اثر سے نہیں ہیں۔ جمّوں وکشمیر کے اُردو شعراء شعوری اور لاشعوری طور پر کسی حد تک اقبالؔ سے بھی متاثر رہے ہیں۔ اور اقبالؔ کی انقلابی شاعری کو خود ترقی پسند ناقدین ترقی پسند شاعری میں شامل کرتے ہیں۔ چناں چہ

آج بھی جب ہم جموں وکشمیر کے اُردو شعراء کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو اگر چہ اُن کے یہاں عام ترقی پسند شاعروں جوشؔ، کیفی اعظمیؔ، سردار جعفریؔ، فیضؔ وغیرہ کی طرح نظریاتی نعرہ بازی نہیں ملتی ہے۔اُن کے یہاں رومانی شاعری اور مذہبی شاعری کے ساتھ ساتھ غربت اور افلاس، حکومت کے ظلم و جبر اور عام آدمی کی مجبوریوں کے حوالے سے ایسے اشعار ملتے ہیں جنہیں ہم یقین کے ساتھ ترقی پسند شاعری کا حصّہ قرار دے سکتے ہیں۔ ریاست جمّوں وکشمیر کے اُردو شاعروں نے کلاسیکی رنگ کی غزلیں اور نظمیں ضرور کہی ہیں لیکن ان کے یہاں لکھنؤ کے شاعروں کی معاملہ بندی اور لذتیت نہیں اور نہ دِلی کے شاعروں کی طرح حد درجہ داخلیت اور فراست ہے بل کہ ریاست جمّوں وکشمیر کے شاعروں نے اُردو شاعری کو ایک معیار اور وقار کے ساتھ برتا ہے۔لہٰذا اقبالؔ کی نظموں میں آنے والے وہ اشعار جن میں انھوں نے غزل کی زبان استعمال کی ہے کشمیر کے شعراء کی نفسیات کے عین مطابق تھے۔ مثلاً اقبالؔ کے ایسے اشعار:

آئے عشاق گئے وعدہ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغ رُخ زیبا لے کر

☆ ☆ ☆

اک اشارے میں ہزاروں کے لئے دِل تو نے
پھونک دی گرمیِ رُخسار سے محفل تو نے

ریاست جمّوں وکشمیر کے شعراء وادباء نے بھی اس دور کے ماحول کے مطابق ایسے ادب کی تخلیق کرنا شروع کیا جو ترقی پسند ادب کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ کیوں کہ اس عہد میں شیخ محمد عبداللہ کی سربراہی میں جاگیردارانہ نظام کے دیگر معاملات کے علاوہ غربت، افلاس، بھوک، غلامی اور استحصال کے مسائل کو خاص اہمیت حاصل رہی۔

۱۹۴۷ء کے بعد ریاست کے شاعروں نے جس طرح سے شاعری کی اس میں مذکورہ ریاست کے حوالے سے ترقی پسند خیالات کا تقریباً اظہار کیا گیا ہے۔ البتہ ملک کے دیگر حصّوں میں جتنا ترقی پسند ادب کا اظہار کیا گیا یا پھر اُس دور میں جو ادب تخلیق ہوا۔ اُس میں نظریہ اور پراپگنڈہ کی طرف زیادہ توجہ صرف کی گئی۔ لیکن اس کے برعکس جمّوں وکشمیر کے شعراء جو شاعری کی اُس میں نہ تو فیشن پرستی ہے اور نہ شدت پسندی ہے بل کہ صرف حاؔلی اور اقباؔل کے تصورات کے اثرات نمایاں ہیں۔

جمّوں وکشمیر میں آزادی سے پہلے ترقی پسند رُجحان بڑی تیزی سے پھیلنے لگا۔ اس رُجحان کو جلا بخشنے میں مہجوؔر اور آزاؔد کی شاعری نے نمایاں رول ادا

کیا۔ ان کی کچھ نظموں میں ترقی پسندی اور جذبۂ آزادی کھل کر سامنے آتی ہے۔بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جو کشمیری عوام کی نسل در نسل غلامی ، اقتصادی زبوں حالی ،افلاس، اور جاگیردارانہ نظام کے ظلم و جبر کے مناظر پیش کرتی ہیں۔ صرف ان کی نظمیں ہی نہیں بل کہ اُن کی کشمیری غزلیں بھی ترقی پسندی کا احاطہ کرتی ہیں۔

آزادی کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں جن شعراء نے ترقی پسندانہ شاعری کی ،ان میں ایک اہم نام شہ زورؔ کاشمیری کا ہے۔انہوں نے ترقی پسند خیالات کا اظہار زیادہ تر نظموں میں کیا ہے مثلاً ان کی نظم ''پری محل'' میں ترقی پسندی کے عناصر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔اسی نظم کے درج ذیل اشعار سے ان کی ترقی پسندی دلکش انداز میں عیاں ہوتی ہے۔مثلاً

سرخ رنگوں سے ہے یوں خاک چمن مہکی ہوئی
ہو چمن میں جس طرح گل کی قباہ دہکی ہوئی

شہ زورؔ کی نظموں میں تو ترقی پسند اشعار کی بھرمار ہے۔لیکن اُن کی غزلوں میں جو ترقی پسند انداز اختیار کیا ہے۔ وہ فیض احمد فیضؔ کی غزلوں کے انداز سے مماثلت رکھتا ہے۔مثال کے لیے اِن کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حاکم کا سیلِ جبر ابھی تند و تیز ہے
ہر اک دریا آج بھی محکوم خیز ہے

☆ ☆ ☆

خواجہ پرست آج بھی مزدور ہے یہاں
پائے خدائے زر پہ گدا سجدہ ریز

☆ ☆ ☆

خونخوار ذہن قیصر و مغفور ہے ابھی
اے وقت، دورِ امن وسکون دوُر رہے ابھی

☆ ☆ ☆

مسلط مہ کشوں پر عجزِ عبرت ناک ہے ساقی
بڑے خطرے میں تیرے میکدہ کی دھاک ہے ساقی

☆ ☆ ☆

بہار آتے ہی گلشن میں یہ کیسا انقلاب آیا
کہ لالہ داغ ''بر دِل گُل'' گریباں چاک ہے ساقی

شہہ زوؔر کاشمیری کے بعد ریاست کے شاعروں میں ایک اہم نام

مہندر رینہؔ کا بھی ہے ۔اب تک رینہؔ کی جو نظمیں اور غزلیں ہم تک پہنچ پائیں ہیں اُن کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے ریاست کے محققین اور ناقدین نے ان کی طرف بے رُخی کا رویہ اختیار کیا اور ان کو وہ مقام و مرتبہ نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق تھے ۔لیکن حقیقت میں ان کی غزلیں ترقی پسندی کے عناصر سے بھر پور ہیں ۔ ان کی غزلیں مصائب و مسائل کا ماتم ہی نہیں کرتیں بل کہ اندھیرے کو اُجالے میں تبدیل کرنے کی ترتیب بھی دیتی ہیں ۔اُنہیں روایتی شاعری سے سخت نفرت تھی ۔کشمیر کے ناگزیز حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے ریاست کے شعراء حضرات کی روایت پسندی پر زبر دست انداز میں طنز کا نشتر چلایا ہے ۔

''اے دوست تعجب ہوتا ہے، ان لوگوں کی بد ذوقی
پر کشمیر کے شاعر ہو کر بھی نجد و ختن کی بات کریں
سنتے ہیں کہ رینہ کانٹوں سے ہر چاک جگر کو سیتا
ہے اس سوختہ جاں، اس سوختہ جاں اس سوختہ جاں
کی بات کریں ۔'' [1]

اپنی غزل میں انہوں نے مشہور ترقی پسند شاعروں ، پرویز شاہدیؔ اور مجروحؔ کا انداز اختیار کیا ہے ۔چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

چھوڑو بھی خزاں کے یہ قصّے ،تعمیر چمن کی بات کریں
کچھ لالہ وگل کا ذکر کریں کچھ سحر وچمن کی بات کریں
آجائے گا آخر موسمِ گل ،اکسیر بنے گی خاکِ چمن
ہر شاخ سے نغمے پھوٹیں گے اک ایسے قران کی بات کریں

ریاست جمّوں وکشمیر کے مایہ ناز اور ممتاز شاعروں میں قابلِ فخر نام رسؔا جاودانی کا ہے ۔ان کا شاعرانہ انداز اور لب ولہجہ دیگر شعراء سے منفرد ہے ۔شاعری میں ان کے جذبۂ احساس کے عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں ۔رسؔا کے شعری مجموعوں ''لالۂ صحرا'' اور ''نظم ثریا'' میں شامل غزلوں اور نظموں کے اشعار میں ترقی پسندی کے عناصر کثرت سے ملتے ہیں۔

ایسی بستی ہو جہاں لوگ ہوں سارے انساں
کوئی ہندو ہو وہاں اور نہ مسلماں کوئی
میں ایک مذہب وحدت کا یوں بناڈالوں
کہ لوحِ دِل سے یہ نقش دوئی مٹا ڈالوں
جو تنگ نظر کم ظرفی سے قطرے کو سمندر کہتا ہے
قلزم کی حقیقت کیا سمجھے وہ وسعت دریا کیا جانے

روایتی ترقی پسندوں سے رسؔا جاودانی کی ترقی پسندی بالکل مختلف ہے ۔ان کی ترقی پسندی زیادہ تر وسیع النظری اوراعلیٰ ظرفی کی حامل ہے جس میں نہ صرف انسان دوستی اور آپسی بھائی چارہ شامل ہے بل کہ مشترکہ تہذیب کو بھی انہوں نے اپنی شاعری کا اہم حصہ بنایا ہے۔

کبھی نہ مسجد و مندر میں امتیاز کروں
بتوں کی کر کے پرشش ادا نماز کروں
طواف کعبہ کو جاوں رہ بنارس سے
خدا سے ملنے کی خاطر بتوں سے ساز کروں

ترقی پسند تحریک کے بنیادی مقاصد میں ایک چیز سماج کے سبھی فرقوں میں انسانیت اور اتحاد و اتفاق قائم رکھنا ہے۔مندرجہ بالا اشعار اسی امر کی عکاسی کرتے ہیں۔

پست ہمت کے لئے آسان بھی دُشوار ہے
اہل ہمت منہ پہ کب لاتے ہیں دُشواری کا نام

☆ ☆ ☆

زلف مشکیں سے رُخ کی زینت ہے
کفر اسلام کا سہارا ہے

☆ ☆ ☆

وہ کون سا ستم ہے جو توڑا نہ دوست نے
ہم سے سلوک کیا نہ ہوا پھر بھی ہم جئے

☆ ☆ ☆

آزادی کے بعد جمّوں و کشمیر کے جن شعراء نے شہرت حاصل کی ان میں راحمٰن راہیؔ کا شمار بھی ہوتا ہے۔ رحمٰن راہیؔ کی پہچان نہ صرف ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے ہے بل کہ وہ اس ریاست کے اہم مفکر اور دانشور بھی مانے جاتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے قبل اور بعد میں انہوں نے اُردو میں بے شمار غزلیں اور نظمیں لکھی۔ ابتدا میں انہوں نے روایتی انداز اختیار کیا۔لیکن اس دوران جو شاعری اُنہوں نے کی وہ اب کہیں بھی دستیاب نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء کے آس پاس وہ ریاست کی نامور شخصیات کے ساتھ کشمیر میں قائم ہونے والی انجمن کے ساتھ جڑے رہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں ترقی پسندانہ خیالات کے عناصر لبریز نظر آتی ہے۔

نقیب نو نے نئے دن کا صُور پھونک دیا
اندھیرا ٹوٹ چکا، سونے والوں کو تو جگاو
قبول جنت فردا کا وعدہ آج مگر

مرے جہاں میں جفا کے جہنموں کو بجھاؤ
زمانہ تھام چکا ہے بغاوتوں کا علم
قدم ملا کے رفیقو قدم بڑھاو بڑھاؤ
اگر چہ راہ بھی خطرناک ہے سفر بھی دراز
مرے شفیق بزرگو مجھے ابھی نہ ڈراؤ

ریاست جمّوں وکشمیر کی ترقی پسند شاعری کے حوالے سے قیصر قلندؔر کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ دراصل انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ہی ترقی پسند ادبی ماحول میں کیا۔ چناں چہ قیصر قلندؔر نے ۱۹۴۶ء میں کشمیر سے شائع ہونے والے روز نامے ''خدمت'' کے مدیر کی حیثیت سے اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا تو اس وقت نہ صرف جمّوں وکشمیر میں بل کہ پورے ملک میں تحریکِ آزادی کی لہر عروج پر تھی جسے آگے بڑھانے میں نہ صرف ادباء بل کہ شعراء نے بھی اہم رول ادا کیا۔ قیصر قلندؔر رجائیت پسند تھے۔ انھوں نے بہت جلد ہی انجمن سے اپنا رشتہ استوار کر لیا اور بعد میں اس کے جلسوں میں مسلسل شرکت کرتے رہے۔ اسی دوران جب سوم ناتھ زتشی کشمیر کی انجمن کے سکریڑی تھے تو اُس وقت جمّوں وکشمیر میں اگر چہ انجمن سرگرم عمل تھیں جن کا بنیادی مقصد ادب اور سماج میں تبدیلی لانا اور بیداری پیدا کرنا تھا۔ اسی بنا پر قیصر قلندؔر بھی ان انجمنوں

میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے رہے۔ جب ۱۹۴۸ء میں انہوں نے آل انڈیا ریڈیو سے اپنا رشتہ جوڑا تو جمّوں وکشمیر کے علاوہ انہیں بیرونِ ریاست کی علمی و ادبی سرگرمیوں کو دیکھنے اور پرکھنے کے کئی موقعے حاصل ہوئے۔

جہاں تک قیصر قلندرؔ کی شاعری کا تعلق ہے تو انہوں نے زیادہ تر نظمیں لکھی ہیں۔ اُن کے دو شعری مجموعے ''ساز و جمال ،'' اُردو'' جن میں نظمیں اور غزلیں بھی ۔ قیصر قلندرؔ نے انگریزی کی صنف '' فنٹاسی '' Fantasy کی طرز پر اُردو میں تصویر لکھنے کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ اوّلین مجموعے ''سازِ جمال'' ہے۔ انہوں نے بیشتر ترقی پسند اور انقلابی انداز کی نظمیں لکھی ہیں۔ اس ضمن میں ان کی مشہور نظم ''لال چوک'' ہے جس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جِسے آج بھی کشمیر کے لوگ ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

جمّوں وکشمیر کے شعراء میں ترقی پسندی کے حوالے سے قیصر قلندرؔ کا اندازِ بیان منفرد ہے۔ کیوں کہ ان کی شاعری میں ترقی پسندی کے عناصر جمالیاتی حسن کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی نظموں میں ترقی پسندی کا جوش وجذبہ کی گھن گرج پائی جاتی ہیں۔

قیصر قلندرؔ کی شاعری میں ترقی پسندی کے عناصر جمالیاتی محاسن کے

ساتھ سامنے آتے ہیں ۔ جو گھن گرج ان کی ترقی پسند نظموں میں ہے وہ ان کی غزلوں میں نہیں ہے۔ ان کے غزلیہ اشعار میں ترقی پسندی کی حرارت حسن کی جدت اور عشق کی شدت کے پہلو میں نظر آتی ہے، مثلاً ان کے یہ اشعار:

جب درد کی شمعیں جلتی ہیں، احساس کے نازک سینے میں
اک حسن سا شامل ہوتا ہے پھر تنہا تنہا جینے میں
یہ رنگ حیا، احساس طرب، آئینہ رُخ میں عکس فگن
اک تابش تیرے چہرے کی اک آنچ سی میرے سینے میں

ریاست کے ترقی پسند شعراء کی فہرست میں غ۔م۔طاؤسؔ کا نام بھی آتا ہے۔ چناچہ جب ۱۹۴۷ء کے بعد جمّوں کشمیر کے حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہورہے تھے تو ایسے حالات کو دیکھ کر کشمیری شعراء میں کشمکش پیدا ہونے لگی تھی جس سے نجات پانے کا واحد راستہ انہیں اُردو شاعری میں نظر آیا۔ طاؤسؔ نے انہی حالات وواقعات کو مدِنظر رکھ کر شاعری کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ اُن کی نظمیں ایسی ہیں جن میں تقریباً ترقی پسندی کے عناصر کی کارفرمائی ہے۔ نظموں کے علاوہ طاؤسؔ نے غزلیں بھی لکھیں ہیں۔ لیکن غزلوں میں انہوں نے ہندی الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی غزلوں کی کیفیت مجروح ہوگئی ہے۔ ان کی غزلوں میں ترقی

پسندی کے عناصر بہت کم پائے جاتے ہیں۔

جمّوں وکشمیر کے مشہور شعراء اور تنقید نگاروں میں محمد آمین کامل کا شمار بھی ہوتا ہے۔ کامل نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز غزل گوئی سے کیا اور پھر نظمیں بھی لکھیں۔ غزل کے مقابلے میں ان کی نظموں کا پلہ کافی بھاری ہے۔ عبدالقادر سروری ''کشمیر میں اُردو'' میں ان کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''کامل کی ابتدائی دور کی غزل، روایت کی پابند تھی،
لیکن یہ ریاست میں ترقی پسند ادب کی تحریک شروع
ہونے کے بعد اپنے کئی معاصرِ سخن کے ساتھ، کامل بھی اس
سے وابستہ ہوگیا اور نئے انداز میں شعر کہنے لگے۔
اور کئی اچھی فکر انگیز نظمیں لکھیں اس تحریک نے دیگر
شعراء کی طرح کامل کو بھی ایک نیا آدرش دیا۔ جس
کا محور انسان تھا اور جس میں تخیل کی کارفرمائی کے
مقابلے میں حقیقی زندگی سے وابستگی نمایاں تھی۔''[2]

امین کاملؔ کے ترقی پسندانہ لب ولہجہ اور ان کی تخیل کی کارفرمائی کا اندازہ ان کے اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ کامل کی شاعری پر نہ صرف مشہور ترقی پسند شاعروں مخدومؔ محی الدین اور جوشؔ کا اثر ہے، بل کہ بعض

اوقات وہی جذبہ بھی دکھائی دیتا ہے۔

آندھیو آو ،اُبلتے ہوئے الاؤ آو
کروٹیں لو حادثو،اے آندھیو، پیہم چلو
بجلیو برساؤ آتش، پھٹ پڑو اے زلزلو

امین کامل کے یہاں غزل کی کلاسیکی زبان میں محرومی و مجبوری کا اظہار بڑے سلیقے سے ہوا ہے اور ایسے اشعار ترقی پسند اشعار سے اپنا رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔

مرگ وہستی کے تسلسل کا تغیر نام ہے
اس تغیر سے نہیں بچنے کی ہے کوئی بھی شے

افسوس کی بات یہ ہے کہ امین کامل کی اُردو نظمیں اور غزلیں ، کہیں دستیاب نہیں ہیں۔

ترقی پسند خیالات کا اظہار ریاست جمّوں وکشمیر کے کچھ اور شاعروں نے بھی کیا ہے۔ان میں جمّوں وکشمیر کے مشہور شاعر عرش صہبائی کا نام سب سے اہم ہے۔

عرش صہبائی ایک خوددار اور بے باک طبیعت کے مالک ہیں ان کی ساری زندگی تنگ دستی اور محرومی میں بسر ہوئی اور بہت سارے مصائب و

آلام نے ان کی زندگی کو گھیرے رکھا۔ وہ اپنی زندگی میں رونما ہونے والے مصائب و آلام سے کبھی گھبرائے نہیں بل کہ بڑی دلیری اور حوصلہ مندی سے تنِ تنہا ان کا سامنا کرتے رہے۔ ان کے مزاج میں خودداری کا جذبہ اس قدر انتہا پر ہے کہ انہوں نے نازک حالات میں بھی کسی کا سہارا نہیں لیا اور نہ ہی انہوں نے غربت، تنگ دستی اور محرومی کی زد میں آ کر کسی کے آگے اپنا ہاتھ پھیلانا گوارہ سمجھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے کسی بھی موڑ پر خودداری، سچائی اور حق گوئی کا دامن نہیں چھوڑا۔ سچائی اور حق گوئی میں نہ وہ اپنے سود و زیاں کا خیال رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی کے پاس کا، ان کی اس روش سے بعض اوقات ان کے دوست و رشتہ دار بھی ان سے خفا ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی سچائی، حق گوئی، غریبی اور خودداری کے جذبے کا اظہار اپنی شاعری میں بڑی بے باکی سے کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے یہاں ترقی پسندی کے اثرات کہیں واضح طور پر اور کہیں رمزیہ انداز میں نظر آتے ہیں:

جھکنے دیا نہ ہم نے جبینِ ضمیر کو
یعنی جہاں میں ہم بھی گنہگار سے رہے

....

لغزشیں اور بھی سرزد ہوئیں مجھ سے اے عرشؔ

یہ خطا بھی ہے کبھی جھک نہ سکا سر میر

....

عرشؔ بے باکی و حق گوئی ہے مذہب اپنا
ہم نہ بدلیں گے کبھی وقت کی چالوں کی طرح

....

کٹتی ہے تو کٹ جائے زباں اپنی مگر
ظلمت کو کسی طور ضیا کہہ نہیں سکتے

....

میں کبھی منصور کی صورت کبھی سقراط ہوں
حق پرستی نے کیا دنیا میں لا فانی مجھے

عرش صہبائی بنیادی طور پر غزل کے ہی شاعر ہیں۔ ان کے یہاں روایتی، ترقی پسند اور جدید ہر طرح کی شاعری ملتی ہیں۔ ریاست جموّں وکشمیر کی شاعری میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا انھوں نے صرف مشاہدہ ہی نہیں کیا بل کہ اُردو میں رونما ہونے والے ہر رُجحان کے ایک پختہ کار شاعر کی حیثیت سے ساتھ بھی دیا ہے۔ چنانچہ عرش صہبائی کے یہاں ترقی پسند کے ایسے نمونے بھی ملتے ہیں۔

دیکھ کر رکھئے قدم اس دور میں
عرشؔ ہے یہ دور ، دور انقلاب

☆ ☆ ☆

بدلنا ہے مجھے اے عرشؔ ، زندگی کا نظام
بلا سے لاکھوں رسوم کہن کے پردے ہوں

☆ ☆ ☆

اے جذبہ خودداری ، اے حسرت مختاری
انسان در انسان پر فریاد کناں کب تک

☆ ☆ ☆

اے اہل ستم تم بھی یہ بات ذرا سوچو
رہتے ہیں ستم خوردہ محروم زباں کب تک

ترقی پسندی کی ایک صورت رجائیت اور اُمید وبیم ہے۔ اور اس طرح کے اشعار جمّوں وکشمیر کے اُردو شاعری میں کثرت سے ملتے ہیں ۱۹۴۷ء کے بعد چوں کہ کشمیر میں بعض مخصوص حالات سامنے آرہے تھے اس لئے اُردو شاعروں نے اپنی شاعری میں تعمیری خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ایسے ہی ایک

شاعر ہیں سیفی شفقؔ سوپوری ، ان کی غزلوں اور نظموں میں تعمیری اور اصلاحی خیالات کس طرح آئے ہیں ان کا اندازہ شفقؔ سوپوری کے درج ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

خاموشی میری بہ انداز فغاں ہے کہ نہیں
دِل کی ہر بات نگاہوں سے عیاں ہے کہ نہیں
تیرے ہونٹوں پہ تبسم کی دمکتی تحریر
ایک منھ بولتا منشور اماں ہے کہ نہیں
پھونک ڈالا تھا کبھی جس نے مرے دِل کا سکوں
اب وہ آتش بہ جگر شعلہ بجاں ہے کہ نہیں

شفقؔ سوپوری شعری تجربات اپنے ماحول اور معاشرے کے پیدا کردہ ہیں اور اسی لیے ان کی شاعری میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی کے عناصر بھی ملتے ہیں۔شفق کی یہ ترقی پسندی ، سکہ بند ترقی پسندی سے مختلف ہے۔اسے عصری حیثیت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ شفق کے یہاں ایسے ترقی پسند اشعار ملتے ہیں :

ہر ایک پھول کہ شعلہ، ہر اک شاخ سناں
ہم ایسے موسم خوف وخطر سے بھی گزرے

سیہ شبوں میں کسی ماتمی جلوس کی شکل
اداس سائے مرے بام ودر سے بھی گزرے
ہزار بار راجالوں کی جستجو میں ہم
پتہ چلا کہ مقام سحر سے بھی گزرے

....

خوف ودہشت دلوں پہ طاری ہے
جنگ لڑنے سے پہلے ہاری ہے
بادشاہی کا دور ختم ہوا
بادشاہوں کا حکم جاری ہے

ایاز رسول نازکی جموں کشمیر کے اہم شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ان کی کئی شعری امتیازات ہیں۔اُردو غزل اور نظم کے جدید تخلیقی رویوں کا برتاؤ ان کی نمایاں خوبی ہے۔لیکن ان کی شاعری میں انفرادی اور اجتماعی،سماجی،ثقافتی اور معاشی مسائل کی ترجمانی جگہ جگہ ملتی ہے اور ایسے اشعار کو بلا شبہ ہم نئی ترقی پسندی کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم نہ مومن ہیں ، ہم نہ کافر ہیں
کلمہ گو ہیں عبادتوں کے بغیر

....

ڈیڑھ کمرے میں زندگی گزری
ایک مدت سے گھر نہیں دیکھا

....

کربلا میں ہی سفر ہو گا تمام
روک دینا اب سفر ممکن نہیں

....

رگوں میں دوڑ تا تو سرخ ہو تا
لہو آنکھوں میں پانی ہو گیا ہے

اس میں شک نہیں کہ نازکی کا لسانی نظام نیا ہے لیکن ان کے الفاظ روایتی اور کلاسیکی معانی سے الگ معنی و مفہوم دیتے ہیں۔ کلاسیکی الفاظ کو ترقی پسند نظرئے کے مطابق برتنے کی مثالیں فیضؔ، مجروحؔ، سردارؔ، جذبیؔ اور کیفی اعظمیؔ وغیرہ جیسے ترقی پسند شاعروں کے یہاں ملتی ہے اور ایاز رسول نازکی کا بھی ترقی پسند اسلوب و لہجے کی اسی صف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ایاز رسول نازکیؔ نے سماجی اور ماحولیاتی کشمکش کے درمیان زندگی کے آہستہ لیکن اس تغیر کو شدت سے محسوس کیا ہے جو آگے چل کر انقلابی تغیرات کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے اور یہ

انقلابی تغیرات ترقی پسند عناصر کے ہی امتیازات ہیں۔

جمّوں وکشمیر کے ترقی پسند شعراء میں مظفرایرج کا شمار بھی ہوتا ہے۔ وہ عصری حیثیت سے تعلق رکھنے والے مواد اور موضوعات کو ایک خاص مقام کا حامل تسلیم کرتے ہیں لیکن اسے زندگی کی سب سے اہم قدر تصور نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی ایسا کوئی دعوی کرتے ہیں کہ عصری حیثیت کے موضوعات تک ہی اب عظیم شاعری کے امکانات محدود ہیں۔

رفیق راز جدید شاعر ہیں لیکن چوں کہ ترقی پسندی ایک آفاقی انسانی قدر ہے۔ رنج والم، عالم انسانیت کا مقدر رہے۔ اس لئے کئی دوسرے جدید شاعروں کی طرح رفیق راز کے یہاں بھی جدید استعاروں، علامتوں اور پیکروں کے حوالے سے ترقی پسند عناصر مل ہی جاتے ہیں۔ مثلاً ان کے یہ اشعار دیکھئے جن سے عصری سماجی یا ترقی پسند صورتِ حال کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

کھلتی ہے آنکھ جلتے مکانوں کی درمیاں
لگتی ہے آنکھ پڑھ کے فسانے ثمود کے

....

آنکھوں میں بھڑکتے ہوئے شعلوں نے کیا کام
منظر کو دھواں ہونے کی چاہت بھی نہیں تھی

....

گرجتا ہوا قلزم بے کراں کا سماں ہر طرف
لکھ نہ دے پیاس کی چلچلاتی ہوئی داستاں ہر طرف

ترقی پسندی کی دھیمی دھیمی آنچ ریاست جمّوں وکشمیر کے ایک اور شاعر اندر جیت لطفؔ کے یہاں بھی ملتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

فکر فردا، ذکر ماضی ہے فضول...... حال کے غم کا مداوا کیجئے
بارِ غم ہی جب اُٹھانا ہے ضرور...... بارِ غم ہنس کر اُٹھایا کیجئے

لطفؔ کے یہاں مایوسی اور بے عملی کی جگہ اُمید اور حرکت وعمل کے جذبات ملتے ہیں۔

اے رہ نورد آبلہ پائی کا ذکر چھوڑ
راہ طلب میں ہمت مرداں کی بات کر
تنگ آ گیا ہوں، حسن و جوانی کے ذکر سے
اللہ اب نہ خواب پریشان کی بات کر

جمّوں وکشمیر کی اُردو شاعری میں جدیدیت کے رُجحان کا عمل ۱۹۸۰ء کے بعد نمایاں ہوتا ہے لیکن یہاں کے عصری حالات نے شاعروں کو

جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی فیشن پرستی سے دور ہی رکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جدید لفظیات میں کشمیر کے اُردو شاعروں نے ریاست کے مسائل اور مصائب کا اظہار جس طرح کیا اس کی وجہ سے ان میں سے بیشتر شاعروں کی غزلوں اور نظموں کو جدیدیت اور ترقی پسندی کا امتزاج کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔اس کی عمدہ مثال حسن انظر کے یہاں ملتی ہے۔

دعا کرنا محاذ زندگی سے سرخرو ہوکر
ترا انظر، ترا شاعر، ترا آشفتہ سر آئے

....

قبیلے والوں تمہارے چہرے بجھے بجھے سے ہیں اس قدر کیوں؟
ابھی تلک تو ہے اپنے سینوں میں رحمتوں کی کتاب روشن

....

گھل مل گئے ہیں عیب و ہنر اپنے وطن میں
حیران بہت ہیں اہل نظر اپنے شہر میں

....

ہر جبیں پر آج بھی لکھا ہوا ہے آدمی
پھر بھی لیکن جا بجا ہیں ششدر و حیران لوگ

شہباز راجواروی بھی ریاست کے اہم شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی شاعری میں عصر حاضر کے انسانوں کی بے بسی اور مجبوری کا اظہار ہلکے لب و لہجے میں ترقی پسندی کی چنگاریوں کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً اُن کے اس طرح کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

مُصر اظہار پر ہو شامِ احساس
سحر کے کرب میں سویا نہ ہو گا

....

مکینوں کا لہو ارزاں ہو شاہباز
مکاں بھی درد میں رویا نہ ہو گا

....

بھول جاؤں میں دوزخ و جنت
ان سے آگے نجات لکھنے دے

....

ہے کتنا کرب زا حساس ہونا

غنیمت ! خود میں ہم ہوتے نہیں ہیں

غلام رسول نازکیؔ کا شمار ریاست جمّوں و کشمیر کے اہم ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری بحیثیت مجموعی ترقی پسند شاعری نہیں ہے بل کہ اُن کی غزلوں اور نظموں میں رومانی اور مذہبی شاعری کے نمونے غالب ہیں پھر بھی نازکیؔ کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جنہیں ہم ترقی پسند شاعری میں شمار کر سکتے ہیں:

خواب عدم سے جاگنے والوں کی بے بسی
آنکھیں ہی مل رہے تھے کہ پھر رات ہو گئی

....

جبیں ناز کو آلودہ ملال نہ کر
میں بے ادب ہوں، مری بات کا خیال نہ کر

....

جل کر ہوئی ہے مٹی، محفل میں شمع محفل
پروانے لے کے نکلا، پروانہ زندگی کا

....

غزلیہ اشعار کے علاوہ نازکی کے یہاں بعض ایسی نظمیں ملتی ہیں

جنہیں ترقی پسند نظمیں کہنے میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ایسی نظموں میں ''ایک اندھی لڑکی کی دعا'' بے حد اہم ہے۔اس نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں:

تو نے سورج کو ضیا بخشی ہے تاروں کو جمال
بارشِ انوار سے دنیا کی کھیتی ہے نہال
نور پاشی میں قمر ہے آپ ہی اپنی مثال
مجھ کو ان چیزوں کی کچھ خواہش نہیں اے ذالجلال
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں
لوگ کہتے ہیں کہ رنگوں کے کئی اقسام ہیں
سرخ ہیں کالے ہیں اور نیلی فام ہیں
اور ان رنگوں سے وابستہ ہزاروں کام ہیں
مجھ کو کیا یہ آنکھ والوں کے لیے انعام ہیں
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

ریاست جموّں وکشمیر کی ترقی اُردو شاعری کو آزادی سے قبل کی ترقی پسند شاعری کو سامنے رکھ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔اس کی دو وجوہات ہیں۔ایک تو یہ کہ ریاست جموّں وکشمیر ہندوستان و پاکستان کے دوسرے صوبوں سے الگ

سماجی اور تہذیبی خوبیاں رکھتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اُردو یہاں کے لوگوں کی اکتسابی زبان ہے، اس کے علاوہ ریاست کی اُردو شاعری آزادی کے بعد سے اب تک رومانیت ، مذہبیت اور جدیدیت سے لے کر مابعد جدیت تک کی منزلوں سے گزر رہی ہے۔ عالمی، قومی اور ریاستی سطح پر سماج کے ساتھ ادب میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ اس لئے ادب کے دوسرے مرکزوں کی طرح جمّوں وکشمیر میں بھی شاعری کا کوئی ایک واضح رنگ نہیں ملتا۔ بل کہ ایک ساتھ رومانیت ، مذہبیت، ترقی پسندی اور جدیدیت بھی نظر آتی ہے۔ خاص طور پر عصرِ حاضر کے جمّوں وکشمیر کے اُردو شاعروں مثلاً حامدؔی کاشمیری، حکیم منظورؔ، فاروق نازکیؔ سے لے کر رفیق رازؔ اور شفقؔ سوپوری تک کے یہاں اظہارِ بیان کے جو رویے ملتے ہیں اُن میں ترقی پسندی بھی ایک اہم رویہ ہے۔ مثلاً حامدؔی کاشمیری جدید اور مابعد جدید شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن اُن کے یہاں رجائیت سے بھرپور جو اشعار ملتے ہیں اُنہیں ترقی پسند شاعری میں رکھا جا سکتا ہے:

شبوں میں یوں ہی بہاتے نہ تھے لہو اپنا
وہ عام لذت تنویر کرنے والے تھے

....

اُفق کے پار بھی کتنے نظارے روشن ہیں

یہ دیکھنا ہے کہ حد نظر کہاں تک ہے

....

خاک سے پھوٹے گی صورت آشنا ہو جائے گی
کون کہتا ہے فنا ہو کر فنا ہو جائے گی

....

خامشی ، بے صوت شبنم کونپلوں پر رات کو
صبح ہو جائے گی ، سیلاب صدا ہو جائے گی

ڈاکٹر صابؔر مرزا ریاست جمّوں وکشمیر کے بزرگ شاعروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔اُردو کے علاوہ پہاڑی اور گوجری میں بھی اپنی شعری صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اس کے علاوہ نثر نگاری اور ترجمہ نگاری کے طور پر بھی ریاست کے لوگ اُنہیں جانتے ہیں۔صابر مرزا کسی خاص تحریک یا رجحان سے تعلق نہیں رکھتے۔لیکن اپنی طویل تخلیقی زندگی میں انہوں نے رومانیت،ترقی پسندی سے لے جدیدیت اور مابعد جدیت تک کا ساتھ دیا ہے۔صابر مرزا کی ترقی پسند شاعری کا رنگ بھی نعرہ بازی سے آزاد ہے لیکن چوں کہ رنج وغم ،مفلسی اور بے بسی عام انسانی کمزوریاں ہیں۔اس لئے صابر مرزا نے بھی اپنے آس پاس کے انسانوں کی غریبی اور مفلسی کو اپنے اشعار میں فنی اور

جمالیاتی خوبیوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔لیکن صابر مرزا کے یہاں نظریاتی کٹر پسندی نہیں ہے۔ پھر بھی اُن کے درجہ ذیل اشعار ترقی پسندی کہلانے کے حق دار ہیں:

سراپا رنج رہا مفلس وغریب رہا
خدایا کرب کا منظر بہت عجیب رہا

....

کرب و بلا منہ پھاڑ کے کہلوائیں گے سچ
کیسے کوئی نُطق پہ تالا دے جائے

....

گھر گھر اب کی بار اُگے ہیں ہنگامے
باخبری ہے جب گھر گھر سو چیں کیوں

....

چلے گی تُند ہوا آندھیاں بچھاڑیں گی
وہ لکھ کے چھوڑ گیا اک اشتہار ایسا بھی

ریاست جمّوں وکشمیر کے ممتاز شاعروں میں فاروق نازکی اپنی منفرد انشوارنہ سوچ اور غیر روایتی شاعرانہ برتاؤ کی وجہ سے پوری اُردو میں

جانے پہچانے جاتے ہیں۔ زمانے کی بدلتی ہوئی قدروں اور ادب کے بدلتے ہوئے نئے سانچوں کی روشنی میں غزلیں اور نظمیں لکھنا اُن کی خوبی ہے۔ دراصل ترقی پسندی میں قنوطیت اور مایوسی کی گنجائش نہیں ہوتی بل کہ رجائیت اور حوصلہ مندی ترقی پسند سوچ کے عالمی معیار ہیں جسے ہر ادیب و شاعر کسی نہ کسی طرح سے ضرور برتتا ہے۔ چناں چہ فاروق نازکی کے یہاں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں جن کی حیثیت مایوسی اور نا اُمیدی کے اندھیرے میں اُمیدوں کے روشن چراغوں کی ہوتی ہے۔ مثلاً اُن کے درجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں، جنہیں ترقی پسند شاعری قرار دینے میں کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے:

پل میں سورج وادیوں میں سرنگوں ہو جائے گا
شعلہ منظر سایہ در سایہ فسوں ہو جائے گا

....

شدت پر ہے ہرے بھرے پتوں کی پیاس
صحرا صحرا خون سمندر لکھنا ہے

....

نوک خنجر روز لکھ لیتی ہے اک دفتر نیا
صبح لے آتی ہے اپنے ساتھ پھر محشر نیا

....

سنگ باری کے لئے موسم نہیں مخصوص اب
سنگ باری ڈھونڈ لیتی ہے ہمیشہ سرنیا

پرت پال سنگھ بیتاؔب ایک معتبر جدید شاعر ہیں غزل کے ساتھ ساتھ اُردو نظم میں بھی انہوں نے شاعری کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں لیکن حکیم منظوؔر، صاؔبر مرزا اور فاروق نازؔکی طرح بیتاؔب کے یہاں بھی ترقی پسندی کی اعلیٰ قدر اُمید، ترقی اور حوصلہ مندی کا شاعرانہ بیان ملتا ہے۔ثبوت کے طور پر اُن کے درجہ ذیل اشعار جن میں اُن کی خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

زندگی یوں تجھے رہنے نہیں دوں گا بے رنگ
تیری تصویر میں کچھ رنگ تو بھر جاؤں گا

....

راز موجوں کے سمندر نے بتائے ہیں مجھے
یہاں ڈوبوں گا کہیں اور اُبھر جاؤں گا

....

احمد شناس اپنے شعری مجموعہ ''پسِ آشکار'' کی وجہ سے پوری اُردو

دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے ہیں ۔ان کا بنیادی شعری رویہ انسانی اور ایمانی ہے۔اسی لئے وہ انسان اور انسانیت کے زوال کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں ۔اس طرح احمد شناس کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جنہیں ہم ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیت کا بہترین توازن کہہ سکتے ہیں ۔

جینے کا تقاضا مجھے مرنے نہیں دیتا
مرکر بھی سمجھتا ہوں کہ ہونے کے لئے ہوں

....

ہر بار یہ مٹی کا بدن ٹوٹ گیا ہے
ہر بار نئے ایک کھولنے کے لئے ہوں

ریاست جمّوں وکشمیر میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں کے یہاں نظریاتی فیشن پرستی اور پروپیگنڈہ کے بجائے، انسان اور انسانیت کے حوالے سے سنجیدہ عصری مسائل غلامی کی زنجیروں کی شکستگی، یاسیت کی جگہ رجائیت کی باتیں فنی و جمالیاتی لوازمات کے ساتھ ملتی ہیں ۔اور خاص طور پر ترقی پسند شاعروں، فیضؔ، مجروحؔ سلطان پوری، سردار جعفریؔ، احسان دانشؔ اور مخدومؔ محی الدین وغیرہ کے یہاں جس طرح ترقی پسند افکار و خیالات کا

اظہار شاعری کے فنی لسانی اور جمالیاتی تقاضوں کے ساتھ کیا گیا ہے اُسی طرح ریاست جمّوں وکشمیر کی ترقی پسند شاعری بھی کلاسیکی شاعری سے الگ کوئی چیز نظر نہیں آتی بل کہ شاعری کی روایت کا اگلا قدم ثابت ہوتی ہے اور اس ترقی پسند شاعری میں روایتی غزل اور نظم کا عکس بھی نظر آتا ہے۔

دراصل عام زندہ زبانوں میں، جیسی کہ اُردو ہے کسی بھی صنف میں معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کے ساتھ جدت اور ندرت تو پیدا ہوتی ہے لیکن اس صنف کی بنیادی خصوصیات میں ایسی تبدیلیاں رونما نہیں ہوتیں جو اس صنف کے اندر لکھی جانے والی تحریروں کو اسکے صنفی امتیازات کے دائروں سے ہی باہر کر دے۔

مجموعی طور پر ریاست جمّوں وکشمیر کے شعراء کا جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھا گیا کہ جمّوں وکشمیر کی ترقی پسند شاعری کا یہاں کی روایتی شاعری سے بھی رشتہ ہے۔ جموں وکشمیر کے ترقی پسند شعرا نے جو غزلیں اور نظمیں لکھی ہیں ان کا رشتہ ایک طرف تو روایتی شاعری سے بھی برقرار رہتا ہے اور دوسری طرف ان غزلوں اور نظموں نے جمّوں وکشمیر میں جدید شاعری کے آغاز وارتقاء کی راہیں بھی ہموار کی ہیں۔

حواشی

1) غلام نبی خیالؔ ۔مضمون۔کشمیری زبان اور شاعری۔مشمولہ۔شیرازہ۔عبدالاحد آزاد نمبر۔ص235

2) عبدالقادر سروری۔کشمیر میں اُردو۔ناشر جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی 1976 ص62

…☆☆☆…

باب سوئم

﴿.. ریاست جمّوں وکشمیر کے اُردو افسانے پر ترقی پسند تحریک کے اثرات ..﴾

ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو افسانہ نگاری کی ایک روشن روایت رہی ہے۔ یہاں افسانہ نگاری نے اپنے عہد میں یہاں کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، جنسی ونفسیاتی مسائل کو اپنے افسانوں میں بہت حد تک پیش کیا ہے۔

ریاست جمّوں وکشمیر میں ۲۰ ویں صدی کے تیسرے دہائی یعنی ۱۹۳۰ء کے آس پاس سے باضابطہ طور پر افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔ ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو افسانے کا آغاز کس سے ہوا اور اُردو کا پہلا افسانہ نگار کون ہے اس کے بارے میں تفصیل نہیں ملتی۔لیکن ڈاکٹر برج پریمی کے مطابق کشمیر میں افسانہ نگاری کا آغاز محمد الدین فوق کے ہاتھوں ہوا۔انہوں نے بہت سے تاریخی اور نیم تاریخی قصّے لکھے۔ ڈاکٹر برج پریمی نے اپنی کتاب ''جمّوں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشو ونما'' میں لکھا ہے:۔

''ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو افسانے کی طرف
سب سے پہلے مورخ، ادیب، شاعر اور صحافی
محمد الدین فوق نے توجہ دلائی۔اگرچہ فوق کی

زندگی کا بیشتر حصّہ پنجاب میں گزرا لیکن
ان کے کشمیریت کے جذبے کے بارے دورائے
نہیں ہوسکتی۔فوق نے روشِ زمانے کے مطابق کئی
تاریخی اور نیم تاریخی قصے قلم بند کیے۔جنھیں ہم
ریاست جمّوں وکشمیر کے اوّلین نقوش کہہ سکتے ہیں۔
اس سلسلے میں ہم مثال کے طور پر سبق آموز کہانیاں
پیش کرسکتے ہیں۔یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس میدان
میں کس سے متاثر ہوئے لیکن بہرحال ان کے
طبع زاد قصّوں کی کہانی کا کنیڈا ضرور ملتا ہے۔'' [1]

ڈاکٹر برج پریمی نے کشمیر میں افسانہ کے آغاز کے بارے میں مزید لکھا ہے:۔

''فوق کے بعد چراغ حسن حسرتؔ کا نام لیا جا سکتا
ہے۔ان کی ادبی حیثیت ہمہ جہت ہے انہوں نے
کسی اور صنف میں اپنا قلم نہیں آزمایا۔ان کے
افسانوں کا مجموعہ ''کیلے کا چھلکا'' ۱۹۲۷ء میں
لاہور سے شائع ہوا۔'' [2]

پروفیسر محمد اسداللہ وانی نے اپنے تحقیقی مقالے''جمّوں وکشمیر میں افسانہ نگاری

آزادی کے بعد'' میں لکھا ہے۔

''جمّوں وکشمیر میں افسانہ نگاری کی ابتداء باقاعدہ
طور پر۳۲۔۱۹۳۳ء سے ہوئی اور سب سے پہلے
افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی ہیں جنہوں نے اپنی
ادبی زندگی کا آغاز بچّوں کے لئے چھوٹی چھوٹی
دردناک کہانیاں لکھنے سے کیا۔'' [۳]

پریم ناتھ پردیسی کے افسانے فن کی کسوٹی پر کھرے اُترتے ہیں۔ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہوئے لیکن زیادہ شہرت ان کے افسانوی مجموعہ ''بہتے چراغ'' کو ملی۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح برصغیر کی سطح پر اُردو میں مختصر افسانے کے بنیادگزاروں میں تین شخصیات راشد الخیری، پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کے نام آتے ہیں اسی طرح ریاست جمّوں وکشمیر میں افسانہ نگاری کی شروعات میں محمد دین فوق، چراغ حسن حسرت اور پریم ناتھ پردیسی کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ چناں چہ جس طرح پریم چند کو آج اُردو کا پہلا افسانہ نگار مانا جاتا ہے اسی طرح پنڈت پریم ناتھ پردیسی کو ریاست جمّوں وکشمیر کا پہلا افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔

پریم ناتھ پردیسی کے افسانے فن کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں اور جب انہوں نے لکھنا شروع کیا تھا اُس وقت ترقی پسند تحریک بھی پروان چڑھ رہی تھی۔

ہندوستان کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ یہ دور ریاستی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر چشمکوں، کشمکشوں، سازشوں اور یلغار کا دور تھا۔ اور عالمی سطح پر بھی فتنہ وفساد اور ہلچل پھیلی ہوئی تھی۔ بہت سی قومیں ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ ان نامساعد حالات میں ترقی پسند تحریک یورپ میں وجود میں آئی اور پھر اس کے بعد اس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ جمّوں وکشمیر کے افسانوی ادب پر اس تحریک کے کیا اثرات رہے ان کو سمجھنے کے لئے تفصیلی جائزہ پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

عالمی ادب کی اگر ورق گردانی کی جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے ہر زمانے و عہد میں حقائق کا عرفان حاصل کرنے سے مختلف نظریے اور فلسفے وجود میں آتے رہے ہیں۔ چوں کہ ادب زندگی ہی کا عکاس وترجمان ہوتا ہے۔ جس طرح سے انسان کی ضرورتوں کی پیداوار اور انسان کے نظریے میں بدلاؤ آتا ہے اسی طرح سے ادب بھی اس بدلاؤ کو قبول کرتا ہے اور ادب زندگی کی بہتری کا سبب بنتا ہے۔ ۲۰ ویں صدی میں جب ظلم وستم کے خوف ناک واقعات سامنے آئے تو پوری دنیا کی تاریخ میں اس کا کوئی جواب نہیں ملتا کیوں کہ اس صدی میں پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کی تباہ کاریاں رونما ہوئیں۔ روسی انقلاب برصغیر میں یورشیں، ہندوستان کی آزادی اور دنیا کے نقشے پر پاکستان کا وجود میں آنا۔ اس سے اندازہ ہوتا

ہے کہ پُرانی روایات کی جڑیں پوری طرح سے ہل گئی تھیں۔اس سے بیداری کی لہر پیدا ہوگئی۔سب لوگ سرمایہ داری کے مطلب کو پوری طرح سے جانچنے اور سمجھنے لگے۔مارکس اور اینگلز کے اشتراکی نظریات عام ہو گئے تھے۔لنین اور ریخوف جیسے مخلص لوگوں نے عوام کی بڑے پیمانے پر قیادت کی۔اُن کی سربراہی میں عوام کا نچلا اور دبا کچلا طبقہ روس کے بادشاہ کے خلاف کھڑا ہوگیا۔۱۹۱۲ء میں روس کے بادشاہ کا تختہ پلٹ گیا اور حکومت کی بھاگ ڈور عوام کے ہاتھ آ گئی۔اس طرح سے روس میں اشتراکی اور عوامی حکومت قائم ہوگئی۔اس انقلاب نے دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا کیوں کہ اُس وقت محنت مزدوری کرنے والے لوگ ایک ساتھ کھڑے ہوکر دنیا کی ظالم و جابرانہ طاقت کو دبانے لگے۔کیوں کہ سارے لوگ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے تھے اور ان لوگوں کو ہٹانا اُن لوگوں کے بس سے باہر ہوگیا۔

۱۹۳۳ء میں جرمنی کے ہٹلر کے فاشزم اور امرانہ رویے نے پورے یورپ میں ایک سیاسی بحران پیدا کر دیا جس نے ملک بھر کے ادیبوں، دانشوروں اور مخلص رہنماؤں کو ایک ساتھ ہونے اور سوچنے کے لئے پلیٹ فارم عطا کیا۔اب ظلم وستم سے تنگ ہوئے لوگوں کا حمایت کا وقت آ گیا تھا۔ جہاں ایک طرف مارکسی اور اینگلز کے نظریات نے سیاسی ایوانوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اسی عہد میں فرائیڈ اور اس کے پیروکاروں نے دماغ کے بند خانوں کے پردے کھودے اور تحلیلِ نفسی

کے ذریعے ادب میں جنسی نفسیات کو سمجھانے کی پوری کوشش کی اور زندگی کو جنسی اظہار کا وسیلہ قرار دیا۔ ادب میں بھی اس کی کارفرمائی ہونے لگی۔ ان ہی حالات میں ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی۔

۱۸۵۷ء میں ہندوستان کی ناکام بغاوت کے بعد زندگی کے ہر شعبے میں بے کاری چھا گئی تھی۔ اب دھیرے دھیرے اس کے اثرات دور ہونے لگے تھے تو سب میں اصلاحی تحریکیں وجود میں آ چکی تھی۔ ان میں سب سے بڑی اصلاحی تحریک سرسید تحریک تھی جس کو ہم علی گڑھ تحریک بھی کہتے ہیں۔ علی گڑھ تحریک نے کافی حد تک اپنی قوم کو تباہی اور بربادی کے بھنور سے نکال کر ترقی کی منزل تک پہنچایا تھا۔ انگریزی سامراج کا ظلم وستم زوروں پر تھا۔ ہندوستان میں ترقی کی بھرپور کوشش ہو رہی تھی۔ پریس کا قیام ہو چکا تھا۔ مسلم لیگ کا قیام بھی عمل میں آ چکا تھا۔ اسی زمانے میں چند دردمند دل رکھنے والے لوگ نوجوان یورپ میں زیرِ تعلیم تھے۔ امریکہ کی آزادی، روس کے انقلاب اور فرانس کے انقلاب کے متعلق سے کتابچے ہنڈ یل اور پمفلٹ پڑھ رہے تھے۔ ان کے دل میں اپنے ملک کی ذمہ داری کا احساس اُجاگر ہو گیا۔ ان کے دل میں ایک انجمن بنانے کا خیال آ گیا۔ ان نوجوانوں میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور جوتی گھوش شامل تھے۔ انہوں نے غور و فکر کرنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں لندن میں ایک انجمن

قائم کی جس کا نام ''انجمن ترقی پسند مُصنفین'' رکھا۔ اور اس کی رپورٹ تیار کر کے ہندوستان کے پڑھے لکھے لوگوں و ادیبوں کو بھیجی جس سے لوگوں میں بیداری کی لہر پیدا ہونے لگی۔

اسی سال سجاد ظہیر ملک واپس آئے اور یہاں بھی ایک انجمن قائم کی ۱۹۳۲ء میں ''انگارے'' کی اشاعت سے تحریک میں کافی تیزی پیدا ہوگئی۔ پروفیسر نور الحسن نقوی یوں رقمطراز ہیں:۔

> ''اس تحریک کا باقاعدہ مینی فیسٹو (منشور) شائع ہوا۔ اس میں اعلان کیا گیا کہ اب ادیب غیر جانب دار نہیں ہوسکتا ہے۔ وہ مظلوموں کی حمایت کریں گے....... زندہ اور سچا ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے۔ اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے اور انسانیت کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے۔ منشور میں اس یقین کا اظہار کیا گیا کہ ہمارے ملک کا ادب زندگی سے اپنے آپ کو وابستہ کرے گا اور زندگی کے ارتقاء کا علمبردار ہوگا۔ ایک اہم بات کہی گئی کہ حسن، آرٹ وغیرہ کی نقاب پہن کر ادیب کارزارِ حیات سے راہ فرار اختیار نہیں کرسکتا۔'' ۴؎

اس گروہ نے آہستہ آہستہ ۱۹۳۵ء تک ایک ادبی حلقے کی شکل اختیار کر لی۔ ہندوستان میں یہ پہلا موقع تھا جہاں مختلف زبانوں کے ادیب وشاعر ایک ساتھ ملے۔ ملک کے معتبر اور نوخیز شاعر و ادیب جن میں منشی پریم چند، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر محمود الظفر ، رشید جہاں ، پروفیسر ہیرن مکرجی، ڈاکٹر اعجاز حسین ، جوش، اختر حسین رائے پوری ، اختر اورنیوی، فیض احمد فیضؔ ، جواہر لال نہرو، آچاریہ نریندر وغیرہ اس تحریک سے جڑے۔ ۱۹۳۶ء میں پہلی کل ہند کانفرس لکھنو میں ہوئی جس کی صدارت پریم چند نے کی اور سجاد ظہیر کو سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ ان کے علاوہ حسرت موہانی ، جے پرکاش نرائن، کملا دیوی، یوسف مہر علی، اندولال اور راجندر کمار وغیرہ نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ ازیں بنگال ، گجرات، مہاراشٹرا اور مدراس کے ادیبوں نے اس میں حصّہ لیا اور زبان کے اسلوبی مسائل پر تقریریں کیں۔ خلیل الرحمان اعظمی اپنی کتاب میں انجمن کے اعلان نامے کو اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

> ''ہمارے ملک میں بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پستی اور رجعت پسندی کو اگرچہ موت کا پروانہ مل چکا ہے لیکن وہ ابھی تک بے بس اور معدوم نہیں ہوئی ہے۔ نت نئے روپ بدل کر یہ مہلک ہمارے تمدن کے ہر شعبے میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ اس لئے

ہندوستانی مُصنفین کا فرض یہ ہے کہ ملک میں جو
ترقی پذیر رُجحانات اُبھر رہے ہیں ان کی ترجمانی
کریں۔نشوونما میں پورا حصّہ لیں۔" ۵

اس کانفرس میں منشی پریم چند نے خطبہ پیش کیا جو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے نئے اور پُرانے ادب کا موازانہ کیا اور انہوں نے واضح کیا کہ ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی وقت کا اہم تقاضہ ہے۔اور اس طرف توجہ کی جائے گی۔پریم چند نے کہا کہ "ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا" تحریک کے زیر اثر معیار بدلنا ہوگا۔حسینوں کے لب و رُخسار، زُلف کے بجائے مزدور کے پسینے کی مہک اور کھیتوں کی بھینی خوشبوں کو سراہا جائے گا۔پریم چند نے کہا:۔

"ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا جس میں
تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی
روہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں
حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔سلائے
نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت
ہوگا۔" ۶

اس تحریک کی وجہ سے ادب کا دائرہ وسیع ہوگیا۔خواب وخیال کی دنیا سے نکل کر

اصل دنیا میں سانس لینا سیکھا۔ شعر وادب کو امیروں کے ڈرائنگ روم سے نکال کر کھیت کھلیانوں، فیکٹریوں تک پہنچادیا۔ اس سے پہلے مزدوروں اور کسانوں کا کوئی حال نہیں پوچھتا تھا۔ لیکن اب شاعر وادیب اس طرف دھیان دینے لگے کہ اس سے پہلے ادب کو امیروں کی جاگیر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ترقی پسند تحریک کی وجہ سے اس کی رسائی عام انسان تک ہوگئی۔ اور دوسرے اصناف کی نسبت افسانہ ترقی پسند تحریک کی مقبول ترین صنف بن گئی تھی۔ اور لکھنے والوں کا ایک حلقہ تیار ہو گیا تھا جن میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، اختر اورینوی، علی عباس حسینی، سہیل عظیم آبادی، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، حسن عسکری، بلونت سنگھ، اختر انصاری، خدیجہ مستور اور رضیہ سجاد ظہیر وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ریاست جمّوں وکشمیر میں افسانے کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب ریاست ڈوگرہ تاناشاہی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ جاگیرداری نظام کی صعوبتوں نے زندگی بے کف کر رکھی تھی۔ غربت، افلاس، پسماندگی، معاشی اور اقتصادی بدحالی، طبقاتی کشمکش اور بیکاری کی لعنت جاگیردارنہ نظام کی دین تھی۔

شیخ محمد عبداللہ کی سربراہی میں ڈوگرہ شاہی ظلم وستم کے خلاف تحریکِ آزادی، بغاوت اور انقلاب کی صدائیں بُلند ہورہی تھیں۔ شاعر اور ادیب لوگ قوم کی

حالت سے بہت متاثر ہو رہے تھے۔ان کے سامنے حدیں اور سرحدیں کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔اگر یوں کہا جائے کہ وہ یہاں ان فلک بوس پہاڑوں پر بیٹھے پوری دنیا کے حالات دیکھ رہے تھے تو بے جا نہ ہوگا۔

ریاست جمّوں وکشمیر میں افسانے کے اس پہلے دور میں پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر، نرسنگھ داس نرگس، ٹھاکر پونچھی، گنگا دھر بھٹ اور کوثر وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔جنھوں نے ترقی پسند تحریک سے پہلے ہی لکھنا شروع کیا اور ترقی پسند تحریک کے آخر تک لکھتے رہے۔ان افسانہ نگاروں کی افسانہ نگاری میں حقیقت پسندی، ترقی پسندی اور رومانیت کا دلکش انداز ملتا ہے۔

۱۹۳۶ء سے پریم ناتھ پردیسی نے لکھنا شروع کیا تھا جو ریاست کے صفِ اوّل کے افسانہ نگار ہیں۔شروع میں یہ یلدرم سے متاثر تھے اور رومانی کہانی لکھتے تھے۔اُردو افسانے کی زُلفیں رومان پسندی میں سنوارتے رہے۔لیکن بعد میں راہِ حقیقت کی طرف متوجہ ہوئے جب انہوں نے رومان پسندی کو چھوڑ کر حقیقت پسندی کی طرف اپنا رُخ بدل دیا۔پروفیسر محمد اسداللہ وانی لکھتے ہیں:۔

''پریم ناتھ پردیسی ابتدا میں ادب برائے ادب کے نقیب تھے مگر جب پریم چند کی کہانی کفن اور

ترقی پسند مُصنفین کا مشترکہ مجموعہ انگارے چھپا اور
اس کے ساتھ ہی ترقی پسند مُصنفین کا باضابطہ قیام
بھی عمل میں آیا تو پردیسی کو یہ احساس شدت کے
ساتھ ہوا کہ ادب برائے ادب کا نظریہ زندگی کے
حقائق کو سمجھنے کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا۔ اس سے
انہوں نے رجعت پسندی، رومانیت، داخلیت،
روایت اور تصور پرستی کے خیالات کو ترک کر کے
خارجی اور افادی پہلوؤں پر کافی توجہ دی۔" ۷

پریم ناتھ پردیسی کی کوششوں سے ریاست میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔
پروفیسر اسد اللہ وانی لکھتے ہیں:۔

"آپ کا (پردیسی کا) جمّوں وکشمیر ترقی پسند ادبی تحریک
کی بنیاد ڈالنے والوں میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے
اس وقت ملک کی سیاسی، سماجی اور ادبی سطح پر بدلتے
ہوئے حالات کا ساتھ دیا۔" ۸

پریم ناتھ پردیسی نے اپنے افسانوں میں ڈوگرہ شاہی کے ظلم وستم، سیاسی وسماجی
بے راہ روی، معاشی واختصادی بدحالی، جہالت، افلاس کو موضوع بنایا ہے۔ اُن کو اس

بات کا بڑا احساس تھا کہ جو لوگ یہاں پر گھومنے آتے ہیں وہ صرف یہاں کی خوبصورتی کو ہی نہیں دیکھیں بل کہ غربت اور افلاس میں یہاں کے لوگ کس طرح سے زندگی گزارتے ہیں اس کو بھی سمجھیں۔ غلام محمد صادق ان کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''خود پر پردیسی کو باہر کے افسانہ نگاروں سے سخت
> شکایت تھی جنہوں نے کشمیر کے قدرتی اور
> خوبصورت مناظر سے متاثر ہو کر تخیلی اور رومانی
> خاکے کھینچے جن کا خاکہ یہاں کی زندگی اور یہاں
> کے خارجی حقیقتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔
> جنہوں نے جنت کو تو دیکھا لیکن جہنم کی آگ میں
> دہکتی ہوئی زندگی کو نظر انداز کیا۔'' 9

''بہتے چراغ'' پردیسی کے منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا آخری افسانہ بھی اسی عنوان سے ہے۔ دریائے جہلم کے دونوں طرف لاتعداد سیاحوں کی قبل از وقت آمد سے حسین ہو گئے ہیں۔ سیاحی نور لوگوں نے ان کے تزئین وآرائش کے سامان کو یہاں کے، بوٹ ہاؤس جن میں اس نے واٹرلو کی لڑائی کی تصویریں فرانسیسی شکار کارگاہوں کی تصویریں، افریقہ کے جانوروں کی تصویریں گویا مختلف اقسام کی

تصویریں آویزاں کی ہوئی ہیں۔اسکا ہاؤس بوٹ سجا ہوا ہے۔ جو بھی سیاح یہاں پر آئے ہیں تو اس کی بہت تعریف کرتے۔ اس ہاؤس بوٹ میں ایک بنگالی جوڑا پر پھل اور اس کی بیوی نلنی یہاں پر چھٹیاں گزار رہے تھے۔ اور پر پھول نے بہت سی جنگوں میں حصّہ لیا ہے۔ دنیا میں امن چاہتا تھا۔ کیوں کہ اس کے دل میں اب جنگ کے نام سے نفرت پیدا ہوگئی ہے۔نن کی کوکھ اب تک خالی ہے۔ قادر کے آدھ درجن بچوں کو دیکھ کر ترس جاتی ہے۔ ملاّ قادر اُس کو بتاتی ہے کہ تم گھی کے چراغ بنا کر دریائے جہلم میں ڈال دو۔ تمہاری من کی مراد پوری ہوگی لیکن نن اس عمل کو رد کرتی ہے اور کہتی ہے:۔

''Non sanse گھی کے چراغوں میں اتنی جان
ہوتی تو میں ہر روز امن کے سینکڑوں چراغ جلا جلا کر
بہا دینا۔'' [10]

لیکن نلنی گھی کے چراغ بنا کر جہلم میں بہا دیتی ہے۔ جلتے چراغوں کو دیکھ کر بچے شور مچاتے ہیں۔ اور یہ سب دیکھ پڑوس میں رہنے والا ایک سیٹھ بھی گھی کے چراغ جلا کر بہا دیتا ہے تا کہ اُس کے کاروبار میں اضافہ ہو۔ جسے پر پھول اپنی پستول کا نشانہ بنا دیتا ہے اور سیٹھ اس کی حرکت سے جھنجھلا جاتا ہے۔ پر پھول اسے کہتا ہے:۔

''اب آپ کے چراغ نہیں جلیں گے سیٹھ جی دنیا

کو امن کی ضرورت ہے۔'' ۱۱؎

پر پھول سیٹھ کو کہنا کہ اب دنیا میں امن کی ضرورت ہے اور خود پر پھول امن شانتی سے گھی کے چراغ بہاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس وقت دنیا میں امن اور شانتی کی کتنی ضرورت تھی۔ یہ صرف ایک پر پھول کی آواز نہیں بل کہ اس دور کے لاکھوں بدنصیب لوگوں کی آواز تھی جسے پردیسی نے احسن طریقے سے اپنے افسانے میں زبان عطا کی ہے۔

پردیسی کے افسانے ''جنت اور جہنم'' میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح سے ہمارے لوگ روزی روٹی کمانے کے لئے بیرونِ ریاست میں جانے پر مجبور تھے۔ اس میں جاگیردار اور مہاجنی نظام کے پس منظر کو بے نقاب کیا ہے۔ اس سے کشمیر کی اصل حالت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ کچھ کشمیری مزدور روٹی کی تلاش کے لیے پیدل کشمیر سے دہلی کے حالات سے واقف ہیں۔ ایک جگہ ایک کردار کہتا ہے:۔

''بخدا کشمیر دوزخ ہے۔ دوزخ اب دیکھو گے دلی
کیا ہے۔ کتنا بڑا شہر ہے۔ ہر طرف دولت ہی
دولت ہے۔'' ۱۲؎

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مزدور لوگ کس طرح سے مہاجنی دور اور سرمایہ داروں سے کچلے ہوئے ہیں۔ بل کہ یہ کشمیر کے متوسط اور نچلے طبقے کی آواز ہے جس کا کوئی

پریشان حال نہیں۔افسانے کا اختتام پردیسی نے بڑی فنی چابکدستی سے کیا ہے اور منظر کی عکاسی کے ساتھ ساتھ کرداروں کے نفسیات کو بھی پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ایک اقتباس:۔

"فسٹ کلاس ڈبے سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی لاٹھی
لٹکاتا ہوا نکلا محصول خانے کے افسر نے اسے سلام
کیا اور اس کے ساتھ ہی درجن بھر وردی پوش
چپراسیوں نے سلیوٹ کیا......افسر نے آہستہ
سے مسکرادیا اور ادھر اُدھر دیکھ کر محصول خانے کے
افسر سے کہا "کشمیر واقعی جنت ہے۔"

"....وہ پہلی مرتبہ پندرہ سو روپیہ ماہانہ پر ریاست میں
آرہے تھے۔ وہ ریل کے راستے جنت کشمیر میں
داخل ہوگے اور پیدل راستے سے درجن بھر کشمیر
مزدور پیٹھ پر بوجھ اُٹھائے دوزخ سے نکل گے۔" [۱۳]

تو اس طرح سے پردیسی نے بہت سے افسانے لکھے جن میں حقیقت نگاری اور ترقی پسندی کا امتزاج ملتا ہے۔ جہاں سرحد ملتی ہے۔نرک، شام وسحر بہتے چراغ، خون کے سکے، اُجالے اندھیرے، دنیا ہماری، اصول کی دنیا وغیرہ اسی طرح کے

افسانے ہیں۔ جس سے ان کی ترقی پسندی کا اندازہ ہوتا ہے اور حق وصداقت کا علم بلند کرنے والوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔

اس عہد کے ایک اور اہم افسانہ نگار پریم ناتھ در ہیں۔ وہ کشمیری ہیں لیکن اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ لاہور گئے۔ جہاں وہ ترقی پسندی سے متاثر ہوئے۔ اس عہد کے ادیبوں اور شاعروں میں علامہ اقبالؔ، ظفر علی خان، ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی صحبت سے پریم ناتھ در نے استفادہ کیا۔ سیاست میں بھی عملی حصّہ لینے لگے۔ کارل مارکس اور لنین کی تحریروں کا بہت ہی دلچسپی سے مطالعہ کرنے لگے۔ اور ان کی تحریروں سے در بہت متاثر ہوئے، اپنے افسانوں سے بھی انہیں رہنما بنانے کی کوشش کی۔ کشمیر میں اُس وقت شیخ محمد عبداللہ شخصی حکومت کے خلاف عام لوگوں کی قیادت کر رہے تھے۔ حکومت نے اس تحریک چلانے والوں کے خلاف جو رویہ اختیار کیا تھا اس سے بچنے کے لئے قائدین لاہور چلے گے تھے۔ ان نامسدعد حالات میں درؔ نیشنل کانفرس کے ایک پروگرام کے رُکن بن گے اور گورنمنٹ کی پوچھ تاچھ اور گرفتاری کے ڈر سے وہ لاہور چلے گے لیکن وہاں بھی آزادی کا پروپگنڈہ جاری کیا۔ ان کا پہلا افسانہ ادبی دنیا لاہور میں شائع ہوا۔ اس زمانے میں درؔ ایک طرف سیاست میں عملی حصّہ لے رہے تھے اور دوسری طرف افسانے کے فن اور تکنیک سے پوری طرح واقف ہو گے تھے۔

جمّوں وکشمیر میں درؔ کا شمار ترقی پسند تحریک کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے اور وہ اس تحریک کے روح رواں تھے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں سیدھے سادھے انداز میں عوام کے مختلف مسائل کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً غربت، جہالت، غلامی، طبقاتی کشمکش، بیکاری وغیرہ۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''کاغذ کا واسدیو'' اور ''نیلی آنکھیں'' منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے کشمیر کی سماجی زندگی کی اچھی طرح سے مرقعہ کشی کی ہے اور ان کے افسانوں کا یہی اصل مقصد تھا۔ جی۔ آر۔ حسرت ان کے افسانوں کے متعلق لکھتے ہیں:۔

> ''پریم ناتھ درؔ کی کہانیاں ہئیت اور مسائل کے اعتبار سے ایک شاندار انفرادی حیثیت کی حامل ہیں۔ ان کے ہاں تجرباتی دانشوری اور تخیل موجود ہے۔ وہ لفظوں کو چُن چُن کر استعمال کرتے ہیں۔ اس کے اکثر افسانوں میں کشمیری ماحول نمایاں طور پر ملتا ہے۔ وہ کشمیری معاشرے کی تصویر کشی کرنے میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔'' [۱۴]

پریم ناتھ درؔ کی ایک خوبصورت کہانی ''بانکری کا ٹلکڑا'' ہے جس کا مرکزی کردار رکمنی اور ایل کاشی ناتھ ہیں۔ افسانے کا آغاز پریم ناتھ درؔ نے اپنے بڑے مشاہدے

اور باریک بینی سے اس طرح کیا ہے کہ قاری ابتدا ہی سے کہانی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ رکمنی اپنی ساری زندگی بدنامی کا بندھن بن کر ایل کاشی ناتھ کے گھر میں گزراتی ہے۔ خوشی رکمنی سے کوسوں دور ہے۔ اس کے گھر میں نوکر چاکر ہیں۔ دوسرے افراد، کنبہ ہے جن کے پیٹ کا دوزخ وہ بھرتی رہتی۔ اسے کھانے پینے میں کپڑے پہننے میں کوئی مزہ نہیں آتا۔ اس کے گھر میں کسی کو بھی اُس کی فکر نہیں ہے۔ ایل کاشی ناتھ عیاشیاں کرتا ہے، مستیاں کرتا ہے اور اس طرح سے وہ آخر میں بیمار ہو جاتا ہے۔ اور ڈاکٹر اصرار کہتا ہے کہ اپریشن کے بغیر کوئی اور چارہ نہیں ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ جب تک اس کی بیوی اپریشن کے لئے دستخط نہیں دے گی اپریشن نہیں ہوسکتا۔ اس کے سب رشتہ دار اس کے ساتھ ہیں بھائی بھتیجے اور دیورانی جیٹھانیاں سب ساتھ ہیں لیکن اس کی بیوی کو کوئی نہیں بلاتا۔ ڈاکٹر صمد ہے، آخر کار رکمنی کی بیٹی شیلا ماں کو گھر سے لاتی ہے۔ رکمی کی ۲۴ سال پہلے شادی ہوئی تھی اور وہی لال ساڑی پہن کر آتی ہے جب وہ آتی ہے تو سب راستے میں اُس کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہسپتال میں پہنچ جاتی ہے۔ جہاں اس کے خاوند کا اپریشن ہوتا ہے۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں مرجاتا ہے رکمنی اپنی ساڑھی کو اپنے مُنہ میں ڈال دیتی ہے۔ اس طرح سے کہانی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن قاری کے من میں وہ ہل چل مچنے لگی ہے کہ افسانے میں درؔ نے گھر کی نجی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کو بڑے فنکارانہ طریقے

سے بیان کیا ہے۔

پریم ناتھ درؔ کا ایک مشہور افسانہ ''کوفتہ'' ہے۔کوفتہ میٹ کی ایک قسم ہے جس کے ذائقہ میں لالہ گھاسی رام کے بیٹے بابورام کو سبزی خوری سے گوشت خور بنا دیا تھا۔ افسانے میں ان کے اور افسانوں کی طرح کشمیر کی زندگی کا حسن مفاہمیت اور اس کی عظمت کا احساس جھلکتا ہے۔کشمیری پنڈتوں کی اولوالعزمی میں ایک فرد بھی ان پڑھ نہیں:۔

''یہ لوگ کتنے عجیب وغریب ہیں برہمن پنڈت،
خوبصورت، فارسی دان، انگریزی دان،
مہاشتسری پھر گوشت پسند، یہ لوگ بڑے بڑے
ہون کرتے۔ بڑے بڑے پاٹھ پھر یہ گوشت اور
تو یہ لوگ دیوتاؤں کو بھی یہی چیز چڑھاتے ہیں۔'' ۱۵

اس سے کشمیر کی زندگی کی حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ایک غریب برف بیچنے والا ٹوکریاں بھر کے اونچے پہاڑوں سے لاتا ہے اور شہر میں آکے تاجروں کو سستے داموں میں بیچتا ہے۔اسی طرح اس غریب کا استحصال ہو رہا ہے۔ ان تلخ حقیقتوں کو بڑے فنکاری کے ساتھ درؔ نے اپنے افسانوں میں برتا ہے۔درؔ فرائیڈ کے نظریے سے بھی کافی متاثر ہیں۔

اُن کا ایک اور افسانہ '' کاغذ کا واسدیو'' ہے۔ جس میں انہوں نے ایک غریب کسان کی زندگی کے بارے میں لکھا ہے۔ وہ غریب کسان اپنے بچوں کو مری ہوئی ماں کی یاد سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنی زندگی کو بچوں کی خوشیوں کے لئے صرف کرتا ہے اور اپنے بچوں کو کسی بھی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتا۔ بالآخر ایک دن برف کے تودے کو ہٹاتے ہٹاتے زندگی کی تھکان سے چور چور واسدیو بچوں کو ہنستا ہنستا اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ پریم ناتھ درؔ کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر اسداللہ وانی لکھتے ہیں:۔

> ''پریم ناتھ درؔ نے اخ تھو، نیلی آنکھیں، کاغذ کا واسدیو افسانے لکھ کر جہاں تشبیہات، استعارات، اشاریت اور ابہام سے کام لیا ہے۔ وہاں طنز کے نشتر بھی چھبوئے ہیں۔ جہاں تک ان کے افسانوں کا تعلق ہے ان میں وارداتِ قلب اور نفسیات کا تحلیلی تجزیہ جُداگانہ ہے۔ طنز و مزاح کے علاوہ استعارات اور تشبیہات کی مدد سے جس شگفتہ بیانی کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔'' [۱۶]

درؔ کا افسانوی ادب میں بہت بڑا نام ہے۔ ان کا اندازِ بیان بہت دلکش و شگفتہ

ہے۔جس میں ایک بے ساختہ پن اُن کے افسانوں میں پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانے میں معاشی اور طبقاتی کشمکش ملتی ہے۔ ہر افسانے میں ان کے احساس کی جھلک ملتی ہے۔ ذاؔ ایسے افسانہ نگار تھے کہ ان کا دل دوسرے کو دُکھی دیکھ کر فوراً متاثر ہوتا ہے۔

کشمیری لال ذاکر ریاست جمّوں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے کشمیر میں رہ کر ترقی پسند تحریک اور کشمیر کی آزادی کے حوالے سے شاید سب سے زیادہ افسانے لکھے ہیں۔ اور جب وہ کشمیر سے باہر تھے تو اُس وقت بھی کشمیر کے بارے میں لکھتے رہے۔ کشمیر کے لوگ کس طرح سے زندگی گزراتے ہیں اُس کے بارے میں لکھا۔ یہاں کے لوگ غربت اور مفلسی کی زندگی گزرانے پر مجبور تھے۔ ''منزل منزل'' ان کا ایسا ہی ایک افسانہ ہے جس میں انہوں نے ایک عورت کی زندگی کو پیش کیا ہے جس کے پاس ہر چیز موجود ہے لیکن وہ پھر بھی اپنی زندگی سے ناخوش معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ میں ایک عجیب وغریب گھٹن محسوس کرتی ہے۔ ذاکر نے اس افسانے میں تحلیلِ نفسی سے کام لیا ہے اور ایک عورت کی سرگذشت کو فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''میرا خاوند ایک اچھی اور مشہور فرانسیسی انشورنس
کمپنی کا ایجنٹ ہے۔ آمدنی معقول ہے اور گھریلو

حالات خوشگوار ہیں لیکن پھر بھی اپنی طبعیت میں
گھٹن پاتی ہوں ۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ
حالات کی مضبوط زنجیروں نے میرے دل و
دماغ کو بُری طرح جکڑ رکھا ہے۔'' ۱۷

ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی کہ اس وقت تقسیمِ ہند کا سانحہ رونما ہوا۔ تقسیمِ ہند صرف ملک کو الگ نہیں کر گئی بل کہ اکثر دلوں کو چیر گئی ۔ اس سے ہجرت اور اتنے فساد شروع ہو گئے کہ جو لوگ ایک ساتھ ایک چھت کے نیچے رہتے تھے وہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گے اور اس وقت خون کی ہولی کا اس طرح ننگا ناچ ہوا کہ اس کو یاد کر کے روح کانپ اُٹھتی ہے۔ اسی طرح سے ذاکر کو بھی اس حادثے نے بہت متاثر کیا۔ اور ان وارداتوں کو انھوں نے اپنے افسانوں کا محور بنا لیا۔ ۱۹۴۸ء میں اُن کا ایک افسانوی مجموعہ ''جب کشمیر جل رہا ہے'' شائع ہوا۔ اس میں شامل سبھی افسانے اسی قبیل کے ہیں۔ دیباچہ میں بلونت سنگھ لکھتے ہیں:۔

''بنیادی طور پر ذاکر کا نقطۂ نظر وہی ہے جو ہند یونین
کے ایک ترقی پسند ادیب کا ہو سکتا ہے اور ہونا بھی
یہی چاہیے۔ لیکن جو نتائج پیش کیے گئے ہیں وہ کسی
خاص مذہب، فرقے یا جماعت کے لئے مخصوص

نہیں ہیں۔ان فسادات میں مظلوم نہ مسلمان تھے
نہ ہندو اور نہ سکھ اگر کوئی مظلوم تھا تو وہ تھی انسانیت۔" ۱۸

کشمیری لال ذاکر کا افسانہ" آج کی رات" اس میں ہندوستان کے تاریک ترین دور کا ایک ورق ہے۔ جسے بھولنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اپنی دھرتی ماں کی خاطر جان دینے والا ایک نوجون اپنی محبوبہ کو غدر کی رات کی کیفیت وحالات لکھتا ہے:۔

"جب تین برس کے بعد تم نے میری خیریت کے متعلق
پوچھا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوا ہے جیسے تم نے موت
کے تیروں کا مقابل کرنے کے لئے مجھے ایک فولادی
ڈھال دے دی ہے۔ تمہاری زندگی کو میری زندگی
سے زیادہ خطرہ ہے۔" ۱۹

ایک دوسرے سے دور کس طرح سے دو جواں دل، موت اور زندگی کی کشمکش سے ڈری ہوئی فضا میں ایک ہی تال پر دھڑکتے ہیں اور جو محسوس کرتے ہیں وہ اس اقتباس سے ملاحظہ کیجیے:۔

"یوں محسوس ہوتا ہے کہ سورج کی روشنی شاید اب کبھی
زمین تک پہنچے گی نہیں آج کی رات ہمارے ملک

کے لئے کتنی اہم رات ہے اس رات کے اندھیرے
میں ہمارا مستقبل سانس لے رہا ہے۔'' ۲۰

فسادات سے متاثر ہوکر بھی کشمیری لال ذاکر نے افسانے لکھے ہیں اور ہو بہو مناظر کی عکاسی کی ہے۔ کشمیری لال ذاکر کا افسانہ ''اُفق'' بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جو ایک ہندو خاندان کی چھوٹی سی کہانی ہے۔ مگر سیدھے سادے انداز کی کہانی کی پُر زور اُٹھان قابلِ تعریف ہے۔

''رام ناتھ کے چلے جانے کے بعد شیلا دیر تک خلا میں
گھورتی رہی ایک خلا جس میں نجی زندگی کی یادیں اور
بدلتے ہوئے ماحول کے خاکے تیر رہے تھے۔'' ۲۱

اور بالآخر انتہائی لفظ تک پہنچ کر جب میاں اور بیوی بے بس فطرت اور پاگل پن کا شکار ہوکر ہسپتال میں مر جاتے ہیں۔ یہ منظر بذاتِ خود بہت دردناک ہے۔ میاں بیوی خاموشی سے آخری بار نظریں ملاتیں ہیں:۔

''لب خاموش تھے لیکن دماغ چیخ رہا تھا۔''

اور پھر موت کی خاموشی تھکن، اکیلا پن اور خاموشی ان کی نگاہوں میں تھی۔ روتی اور مایوس انسانی زندگی کی اس سے بہتر منظر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ والدین کے موت کے بعد ان کا لڑکا روی بھی بستر پر پڑے ہوئے والدین کی تصویر دیکھ رہا تھا۔

''جنہوں نے اس کی زندگی سے اچانک اپنا خشک
سایہ ہٹا کر اسے یتیمی کے تپتے ہوئے صحرا میں
پھینک دیا تھا اور اس کی معصوم شفاف اور چمکتی
ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے آنسوؤں کا
ایک اُفق لرز رہا تھا۔ ایک ایسا اُفق جو خون کے
داغوں، خنجر کی دھاروں اور آگ کے شعلوں
سے روشن تھا۔'' ۲۲؎

افسانہ ''اُفق'' کی سادگی اور پرکاری کا ایک دلکش نمونہ ہے اور مرکزی نقطہ نظر اور شدت تاثر کے لحاظ سے یہ ایک ممتاز کہانی ہے اور ذاکر بالکل عینی مشاہدین کی طرح کہانی کے تانے بانے بنتا اور واقعات کی کڑیاں جوڑتا ہے۔

موہن یاور ریاست جموں وکشمیر کی افسانہ نگاری میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ موہن یاور نے آزادی سے پہلے ہی افسانے لکھنے شروع کیے تھے۔ موہن یاور نے ۱۹۴۰ء کے آس پاس لکھنا شروع کیا۔ اُن کے افسانوں کا مجموعہ ''سیاہ تاج محل'' افسانہ نگاری کے فن پر مضبوط گرفت کا ثبوت ہے۔ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ریاست جموں وکشمیر کی جنگ آزادی اور یہاں کے حالات کو مختلف زاویوں سے دکھایا ہے۔ موہن یاور کے تین افسانوی مجموعے ''وسکی

کی بوتل''، ''تیسری آنکھ'' اور'' سیاہ تاج محل'' قابلِ ذکر ہیں۔'' وسکی کی بوتل'' کا پیش لفظ ٹھاکر پونچھی نے لکھا ہے اور اس میں انہوں نے موہن یاورکو ایک عظیم سرکش اور باغی افسانہ نگار کے القاب سے یاد کیا ہے۔جمّوں کی سنگلاخ زمین سے دلکش افسانے تخلیق کرنے میں موہن یاور کی ذہانت پر زور دیتے ہوئے ٹھاکر پونچھی نے رمزیہ انداز میں لکھ ہے کہ:۔

''سعادت حسن منٹو کے علاوہ اگر کسی افسانہ نگار نے
افسانے نگاری کی بنجر پتھریلی دھرتی میں بیج بوئے
کھیتی کاٹی اور اس فصل کے بوئے پر اپنی پیاس
سانسوں سے آبیاری کی ہے تو وہ موہن یاور ہے۔'' ۲۳

دراصل افسانہ بیانیہ کی ایک طاقت ور صورت ہوتی ہے۔لیکن افسانے کی بھی ایک الگ شعریات ہوتی ہے۔جس کا تقاضا یہ ہے کہ افسانہ نگار جو کچھ کہنا چاہئے وہ قاری تک صرف الفاظ کے ذریعے نہ پہنچے بل کہ افسانے میں زبان کے لسانی برتاؤ کی بنا پر افسانہ نگار کی سوچ اور فکر السطور سے نکل کر قاری تک منتقل ہوجائے۔

موہن یاور کے افسانے مثلاً'' تیسری آنکھ'' اور'' وسکی کی بوتل'' وغیرہ کے اندازو اسلوب سے واضح ہوجاتا ہے کہ افسانے کی شعریت کے اس پہلو سے وہ پوری

پوری واقفیت رکھتے تھے۔ دیوندر ستارتھی نے موہن یاور کی افسانہ نگاری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

''موہن یاور کے افسانوں میں ہمارے گردوپیش کی زندگی سانس لیتی ہے۔''

اس جملے میں سب کچھ ہے۔ وہ چیز ہے جسے ادب میں ارضیت یا مقامیت کہتے ہیں۔ وہ چیزیں مخصوص علامتوں کے حوالے سے موہن یاور کے یہاں نظر آجاتی ہیں۔ موہن یاور نے اپنے افسانوں میں مثلاً اُڑتے آنچل، چائے اور لپ اسٹک، تیسری آنکھ، سیاح تاج محل وغیرہ میں ارضیت یا کشمیریت کی جو مثالیں پیش کی ہیں۔ ان کا سلسلہ جمّوں وکشمیر کی آزادی کے پہلے اور آزادی کے بعد کی صورتِ حال سے ملتا ہے۔ وہیں موہن یاور اُردو کے چوٹی کے افسانہ نگاروں جیسے سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی کی طرح اپنے انداز میں کم سے کم الفاظ میں مدعا بیاں کرنے اور تاثر قائم کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔

ٹھاکر پونچھی ریاست جمّوں وکشمیر کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے ۱۹۳۵ء سے لگ بھگ لکھنا شروع کیا۔ وہ مارکس اور فرائیڈ کے نظریے کے حامی ہیں۔ وہ پونچھ میں جاگیردارانہ عُہدے سے وابستہ رہے اور ایک مدت تک شاہی دربار سے منسلک رہے۔ انہوں نے اُس وقت جاگیرداری اور سرمایہ داری کے بڑھتے ہوئے مظالم،

ان کی مفلوک الحالی، کسمپرسی، بیماری اور بے روزگاری کو بڑے قریب سے دیکھا اوراس سے ٹھاکر پونچھی کے اندر کا آدمی جاگ گیا اور وہ عوام کی خدمت کے لئے کمربستہ ہو گے۔ وہ ایک متحرک قلم کا ربن گے اور عوامی مسائل پر بھر پور لکھنے لگے۔ان کے دوافسانوی مجموعے ہیں''زندگی کی ڈور''اور''چناروں کے چاند'' منظرعام پر آ چکے ہیں۔افسانے کے فن، ہئیت اور تکنیک سے وہ اچھی طرح سے واقف تھے۔ان کا عہد سامراجی اور جاگیرداری نظام کی آخری نویدآزادی کی بشارتوں کا عہد ہے۔ جہاں نئی اور پُرانی تہذیبی متصادم ہو رہی تھیں نئے مسائل ومسائب ابھر رہے تھے جن کووہ اپنے افسانوں کے ذریعے اُجاگر کررہے تھے۔

''موت کے سائے تلے''افسانے میں میجر ریفرڈ کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ کو بڑے فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔جو پہلی اور دوسری عالم گیر جنگوں میں حصّہ لیتا ہے اور ترقی کر کے معمولی سپاہی سے میجر بن جاتا ہے۔وہ کہتا ہے:۔

''اور پھرایک وقت آیا۔میں نے انسانوں کوگولی کا
نشانہ بنایااورخوش ہوا۔انہیں تڑپتے اور سسکتے دیکھ
کرمسرت حاصل کی۔ترقی ملی، بہت بڑا رُتبہ
حاصل ہوا۔اسی دورانِ امن میں قتل کی سزا پھانسی
جلاوطنی،قید،دورانِ جنگ میں قتل کی سزا ترقی،

انعام واکرام۔"   ۲۴؎

وہ مزید کہتا ہے:۔

"دورانِ جنگ انسانوں کو انسان مارتے روندتے
کچلتے آگے بڑھتے گئے۔ظالم ومظلوم کی کوئی پہچان
نہ تھی۔آگ خون اور پیپ کا ایک سمندر تھا جسے ہم
عبور کرتے تھے۔"   ۲۵؎

آخر میجر ریفرڈ کا ضمیر اسے جھنجھوڑتا ہے اور وہ بیزار ہو جاتا ہے۔جنگ کے بعد کی ہولناک فضا گویا اس سے کہہ رہی تھی:۔

"یہ اُجڑے ہوئے کھیت اور ویران کھنڈر یہی کہہ
رہے تھے کہ انسانوں کو سپاہیوں کی نہیں کسانوں
کی ضرورت ہے،مزدوروں کی ضرورت ہے...
...پھر اب ایک سپاہی نہیں ہوں ایک کسان
ہوں وہ کسان جس کے پاس پاشا کے گیت اور
پاشا کی آواز ہے۔عظیم وابدی جاری وساری
ہے۔"   ۲۶؎

ٹھاکر پونچھی نے ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو متحرک ہیں اور واقعات اور

حالات کے ساتھ بدلتے ہیں۔ بُروں کے دل بدلنا اور بُرائی کو صفحہ ہستی سے ختم کرنا جن کا مقصد ہے جو ترقی پسند تحریک کا بھی منشور ہے۔ ''موت کے سائے تلے'' کے علاوہ ''پگڑی پگڑی''، ''مرد وعورت''، ''کتنا سفر''، ''زندگی کی دوڑ''، ''موت سے پہلے''، ''زندگی کے بعد''، ''ابھی دور جانا ہے''، ''حکومت''، ''چکنا'' اور ''چنار کے چاند'' ان کے اہم ترین افسانے ہیں اور یہ افسانے کی دنیا میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

راما نند ساگر آزادی سے پہلے افسانہ نگاروں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شہرت خاص کر ان کے ناول ''اور انسان مرگیا'' کی وجہ سے زیادہ ہے۔ لیکن انہوں نے افسانے بھی بہت سارے لکھے ہیں جو ان کے افسانوی مجموعہ ''آئینے'' میں شامل ہیں۔ راما نند ساگر کا اندازِ بیان طنزیہ ہے۔ جس میں ہمیشہ ظرافت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ راما نند ساگر بھی ترقی پسند تحریک سے کافی حد تک متاثر تھے۔

لیکن ان کو ترقی پسند افسانہ نگار نہیں کہہ سکتے۔ ساگر اپنے افسانوں میں کردار کی نفسیات میں جھانکنے کے عادی ہیں۔ وہ خارجی اور ظاہری واقعات سے زیادہ انسان کے باطنی اور اندرونی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں ہیں۔ اس امتیاز کو ان کا منفرد آرٹ کہا جاسکتا ہے۔

آزادی اور تقسیم سے متعلق اپنے ناول ''اور انسان مرگیا'' میں انہوں نے یہی

تاثر دیا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے نام سے برصغیر کے عوام کو آزادی تو مل گئی لیکن انسان مر گیا۔ ہندو مسلم کے فسادات نے انسانیت کو مار دیا۔ بعض افسانوں مثلاً ''آبِ حیات'' اور ''آب و آتشی'' میں بھی انسانی نفسیات کی گرمیں کھول کر انسان کو ایک آزاد وجود کے طور پر دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ رامانند ساگر کا انتقال بمبئی میں ہوا۔ انہوں نے فلم پریوڈیسر کے طور پر بھی کافی شہرت پائی۔

ریاست جمّوں و کشمیر میں ترقی پسند افسانہ نگاروں میں قدرت اللہ شہاب کی شہرت ایک عظیم ادیب، سیاست دان اور دانشور کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ قدرت اللہ شہاب نے بھی آزادی سے قبل لکھنا شروع کیا۔ انہوں نے اپنی سوانحِ حیات ''شہاب نامہ'' میں ریاست جمّوں و کشمیر میں ترقی پسند تحریک اور تحریکِ آزادی کے حوالے سے بعض سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے جن وہ خود بھی ایک اعلیٰ آفیسر کے طور پر شریک تھے۔ شیخ محمد عبداللہ کی سوانحِ حیات ''آتشِ چنار'' کے بعد ''شہاب نامہ'' ہی دوسری کتاب ہے جس میں اس ریاست کی تحریکِ آزادی کے بعض ان گوشوں پر روشنی پڑتی ہے جس سے ریاست کے عام لوگ ناواقف تھے۔

قدرت اللہ شہاب کی افسانہ نگاری کا امتیاز ان کی نفسیات نگاری رہی ہے۔ آزادی اور تقسیم کے حوالے سے ان کا افسانہ ''یاخُدا'' اہم ہے۔ تقسیمِ ملک پر لکھے گے

نمائندہ افسانوں کی صف میں رکھا جاتا ہے۔ان کے افسانوں میں ''پشاور ایکپریس''، ''کھول دو''، ''لاجونتی'' وغیرہ اہم ہیں۔ تقسیمِ ملک کے بعد قدرت اللہ شہاب پاکستان چلے گے اور وہاں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔آزادی سے قبل انہوں نے ریاست میں رہتے ہوئے متعدد ایسے افسانے لکھے جن میں غلامی کا کرب اور آزادی کا خواب صاف نظر آتا ہے۔اس ضمن میں ان کے افسانے ''سردار جسونت سنگھ'' اور ''درد کا درماں'' بے حد اہم اور قابلِ ذکر ہیں۔

ریاست جمّوں وکشمیر میں ترقی پسند تحریک کے عہد کے نمائندہ افسانہ نگاروں کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ترقی پسند تحریک کا دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۵ء تک ہی متعین کیا جاتا ہے لیکن اس دوران ملک تقسیم ہو جاتا ہے اور ہماری ریاست کے بہت سے افسانہ نگار پاکستان چلے جاتے ہیں۔جن میں قدرت اللہ شہاب، محمد عمر نورالٰہی، کوثر سیمابی، محبوبہ یاسمین، طالب گورگانوی، کیفی اسرائیلی، گلزار احمد فدا، اخگر عسکری، شیخ منظور، الٰہی عبدالعزیز طلاع وغیرہ پاکستان چلے گے۔اور رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر، دیا کرشن، جگدیش کنول، کندل لال، ٹھاکر پونچھی اور پریم ناتھ در وغیرہ ملک کے دیگر حصّوں میں جاکر رہائش پذیر ہو گئے۔افسانہ نگاری کے تخلیقی سوتے خشک ہو گے۔یہاں یہ عرض کرنا بھی مناسب ہے کہ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے لکھنا شروع ہی کیا تھا اور ان کی فنی قدریں بھی متعین نہیں ہوئی تھیں۔بعض کی

تخلیقات اب نایاب ہیں جس کی وجہ سے اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ حالات کے معمول پر آنے اور سنوارنے میں وقت لگ گیا۔ زندگی کے تقاضے بدل گے۔ ترقی پسند تحریک جو بڑے پیمانے پر عوام کی کفالت کر رہی تھی مفلوج ہوگئی۔ ادیب وشاعر بھی اس سے بیزار ہو گئے ۔ یہاں پر بات ذہن نشین رہے کہ کوئی بھی تحریک و رُجحان یک لخت پنپ کر سامنے نہیں آتا ہے اور نہ ہی اس بات کے اثرات ختم ہوتے ہیں۔ البتہ وقت اور زمانے کے تقاضوں نے نئے نظریے وجود میں لائے اور پُرانے نظریے کے مثبت زاویوں سے خلط ملط ہو کر اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گے ہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ ترقی پسند افسانہ ختم ہو گیا ہے بالکل درست نہیں ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے دور میں بھی ترقی پسندی کے آثار ملتے ہیں جو آج بھی ادب کی اہمیت، افادیت اور مقصدیت کے لئے ویسے ہی قائل ہیں۔

مختصر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کشمیر میں ترقی پسند تحریک ایک اہم ادبی تحریک رہی۔ اس تحریک نے کشمیر میں ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت صورت اختیار کر لی تھی اور اس نے اُردو ادبیات ہی نہیں بل کہ کشمیری، ڈوگری، گوجری اور پہاڑی ادب کی بھی نئی سمتیں اس تحریک نے متعین کیں۔ اس سے کشمیر میں ادب کا کوئی سنجیدہ قاری اس تحریک کے تاریخی اور افادی رول کو

صرف نظرانداز نہیں کرسکتا۔

﴾... ☆☆☆☆ ...﴿

حواشی

۱۔ ڈاکٹر برج پریمی، ''جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشونما''، رچنا پبلی کیشنز، جموں، ص ۲۶، ۲۷۔

۲۔ ڈاکٹر برج پریمی، ''جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشونما''، رچنا پبلی کیشنز، جموں، ص ۲۷۔

۳۔ پروفیسر محمد اسداللہ وانی، ''جموں وکشمیر میں افسانہ نگاری آزادی کے بعد''، ص ۹۷۔

۴۔ پروفیسر نورالحسن نقوی، ''فن تنقید اور اُردو تنقید نگار''، ۲۰۰۹ء، ص ۳۴، ۳۳۔

۵۔ خلیل الرحمان اعظمی، ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک''، ص ۴۰۔

۶۔ خلیل الرحمان اعظمی، ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک''، ص ۴۵۔

۷۔ ہمارا ادب، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر انتخاب نمبر ۹۷۔۱۹۷۸ء، ص ۳۴۲۔

۸۔ ہمارا ادب، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر انتخاب نمبر ۹۷۔۱۹۷۸ء، ص ۳۴۱۔

۹۔ بہتے چراغ، مرحوم پردیسی کے منتخب افسانے، مکتبہ لالہ رُخ سرینگر، ص ۷۔

۱۰۔ بہتے چراغ، مرحوم پردیسی کے منتخب افسانے، مکتبہ لالہ رُخ سرینگر، ص ۱۹۹۔

۱۱۔ بہتے چراغ، مرحوم پردیسی کے منتخب افسانے، مکتبہ لالہ رُخ سرینگر، ص ۱۹۷۔

۱۲۔ دنیا ہماری، مرحوم پردیسی کے منتخب افسانے، مکتبہ لالہ رُخ سرینگر، ص ۲۷۔

۱۳۔ دنیا ہماری، مرحوم پردیسی کے منتخب افسانے، مکتبہ لالہ رُخ سرینگر، ص ۲۷۔

۱۴۔ چناروں کے سائے تلے، پریم ناتھ در، ص ۱۶۔۱۵۔

۱۵۔ چناروں کے سائے تلے، پریم ناتھ در، ص ۱۳۹۔

۱۶۔ چناروں کے سائے تلے، پریم ناتھ در، ص ۱۹۔

۱۷۔ توی اور جہلم، موہن یاور، ص ۶۸۔

۱۸۔ جب کشمیر جل رہا تھا، کشمیری لال ذاکر، ص ۷۔

۱۹۔ جب کشمیر جل رہا تھا، کشمیری لال ذاکر، ص ۱۰۔

۲۰۔ جب کشمیر جل رہا تھا، کشمیری لال ذاکر، ص ۱۴۔

۲۱۔ جب کشمیر جل رہا تھا، کشمیری لال ذاکر، ص ۲۰۔
۲۲۔ جب کشمیر جل رہا تھا، کشمیری لال ذاکر، ص ۳۱۔
۲۳۔ عبدالقادر سروری، کشمیر میں اُردو، ص ۱۸۱۔
۲۴۔ زندگی کی ڈور، ٹھاکر پونچھی، ص ۲۱۔
۲۵۔ زندگی کی ڈور، ٹھاکر پونچھی، ص ۱۹۔
۲۶۔ زندگی کی ڈور، ٹھاکر پونچھی، ص ۱۹۔

... ☆☆☆☆ ...

باب چہارم

﴿... اُردو ناول پر ترقی پسند تحریک کے اثرات ...﴾

ریاست جمّوں و کشمیر جہاں ایک طرف صنعت و حرفت اور اپنے حسین و جمیل قدرتی مناظر کے ساتھ دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ وہیں دوسری طرف علم و ادب کے حوالے سے بھی اسے امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یہ دُنیا کی مختلف زُبانوں میں اپنی خوبصورتی پر قصیدے لکھوا چکی ہے۔ یہ خوبصورت ریاست تین خطوں میں تقسیم ہے۔ جمّوں، کشمیر اور لدّاخ۔ ان تینوں خطوں کی اپنی الگ الگ زبان ہے۔ جمّوں میں ڈوگری، کشمیر میں کشمیری اور لدّاخ میں لدّاخی رائج ہے۔ لیکن اُردو زبان نے ان تینوں کو ایک زنجیر کی کڑی کی طرح جوڑے رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ریاست میں علاقائی اعتبار سے چھوٹی چھوٹی علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جمّوں و کشمیر واحد ایسی ریاست ہے جس میں بحیثیت سرکاری زبان اُردو رائج ہے۔ اس اعتبار سے ریاست میں اُردو زبان نے ادبی سطح پر بھی خوب ترقی کی۔

ریاست جموں و کشمیر صدیوں سے علم و ادب اور دانشوروں کی آماجگاہ رہی ہے۔ اس ریاست میں ایسے ایسے نامور محقق اور دانشور، شعراء و ادباء پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے برصغیر میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ یہاں کے ادیبوں اور شعراء

نے ہر صنف میں طبع آزمائی کر کے ریاستی اُردو ادب کے ذخیرے میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔

ریاست میں اُردو ناول کی تاریخ افسانے کے مقابلے میں زیادہ نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کرریاست میں کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا تھا۔ ملک کے دوسرے حصّوں سے مختلف رسائل و جرائد شائع ہورہے تھے۔ اس وجہ سے ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں ناول کو زیادہ فروغ ملا۔ اُردو کے بہت سے ناول نگار مثلاً پریم چند، شرر، سرشار،

کرشن چندر، بیدی، عصمت اور دوسرے فنکار عرصہ دراز تک اخبارات اور رسائل میں اپنے ناول قسط وار لکھتے رہے۔ شاعر، آج کل، بیسوی صدی، نقوش، شاہراہ اور افکار وغیرہ نے کتنے ہی ناولوں کو کتابی شکل میں شائع ہونے سے قبل اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ منشی پریم چند کا پہلا ناول ''اسرارِ معابد'' بنارس کے ایک ہفت روزاخبار میں شائع ہوتا رہا۔ ریاست جمّوں وکشمیر میں فن کار اُس وقت اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے جب اُردو کا پہلا اخبار ''رنبیر'' جموں سے شائع ہوا۔

جہاں تک جمّوں وکشمیر میں اُردو ناول کا تعلق ہے تو اس کے ابتدائی نقوش ۱۹ویں صدی کے آخر اور ۲۰ ویں صدی کے شروع میں سالگ رام سالکؔ اور محمد دین فوق کی بعض تصانیف میں ملتے ہیں۔ سالگ رام سالکؔ کی ''داستانِ جگ روپ'' اور

''تحفۂ سالک'' میں اگرچہ فوق الفطرت عناصر موجود ہیں تاہم ان قصّوں پر کہیں نہ کہیں کہانی پن کا تاثر اا موجود ہے۔

ان مذکورہ بالا تصانیف کو ناول کی خصوصیت ہونے کی وجہ سے ناول کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ حالاں کہ تکنیکی اعتبار سے اس میں فنی لوازمات کہیں پر بھی موجودنہیں ہیں۔ سالگ رام سالکؔ سے زیادہ اچھی کوشش محمد دین فوق کے یہاں دیکھنے کوملتی ہے۔ انہوں نے متعدد تصانیف پر قلم اُٹھایا ہے۔ ڈاکٹر بریمی رومانی اپنی کتاب فکر ونظر میں یوں رقمطراز ہیں:

''یہ دونوں قلم کار متنوع دلچسپیوں کے حامل تھے۔ ادب اور صحافت سیاست اور کشمیریت سے انہیں لگاؤ تھا۔ دونوں قلم کاروں نے علم و ادب کے گوناگوں موضوعات پر کتابیں لکھیں اور چوٹی کے ادیبوں اور صحافیوں میں نام پیدا کیا۔ دونوں نے ریاست میں اُردو اخبار جاری کرنے کی کوشش کی لیکن حکومتِ وقت کی اجازت نہ ملنے پر اُن کی کوششیں رائگاں ہوگئیں۔''[1]

سالگ رام سالکؔ، پنڈت ہرگوپال کول خستہؔ کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ اپنے زمانے

کے صحافی، قانون دان، شاعر اور مشہور و معروف ادیب تھے۔ اسی وجہ سے سالگ رام سالک کو ادب اور صحافت سے بچپن میں ہی لگاؤ ہو گیا تھا۔ انہوں نے درجنوں کتابیں لکھیں۔ ان میں ''داستانِ جگت روپ''، ''تحفۂ سالک''، ''دھرم اُپدیش''، ''سوانح عمری مہاراجہ گلاب سنگھ''، ''شاستر راتھ''، مورتی مُنڈن''، ''خطرہ تعلیم'' کے علاوہ کئی اور چھوٹی چھوٹی کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔

''خطرہ تعلیم'' انہوں نے عورتوں کی تعلیم پر لکھی تھی۔ سالک رام سالک اُردو کے سب سے پہلے ناول نگار ہیں جو مولوی نذیر احمد سے کافی متاثر تھے۔ اسی وجہ سے ''داستانِ جگت روپ'' اور ''تحفۂ سالک'' میں نذیر احمد کا اسلوب ملتا ہے۔ لیکن دونوں ناول ریاست جموں و کشمیر کے اولین ناول تصور کیے جاتے ہیں۔ ''داستانِ جگت روپ'' انہوں نے قلعہ باہو کے قید خانے میں لکھی تھی اور ''تحفۂ سالک'' میں تاریخ اور سفرناموں کا امتزاج ملتا ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب ''کشمیر کے دو ادیب، دو بھائی'' میں سالک کے ''قصّہ جگت روپ'' پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''سالک کی اس داستان کا محرک کون سا افسانہ ہوا۔
اس کا پتہ نہیں چلتا، تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس
طرح ان کی مثنوی ''سندر بدن'' کا محرک میر حسن کی

سحر البیان ہوئی اس افسانہ کا محرک غالباً رجب علی
بیگ سرور کا فسانہ عجائب ہوا اس کا ثبوت داستان
جگت روپ کا اسلوبِ بیان ہے۔ جو کافی حد تک مسجع
اور مقفیٰ ہے۔'' ۲؎

محمد دین فوق کے یہاں ناولوں کا فنی شعور سالک سے زیادہ ترقی یافتہ صورت میں ملتا ہے۔ فوق نے ایک سو سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ نثری کارناموں میں انہوں نے تاریخی و نیم تاریخی قصّے تصنیف کیے۔ ان کے بعض قصّوں میں ناول کی جھلک دکھائی دیتی ہے جس کا اعتراف انہوں نے خود بھی کیا ہے۔ ''اکبر'' اور ''انارکلی'' ان کے دو مشہور تاریخی ناول ہیں۔ جن کو ہم بیسویں صدی کے اوّلین ناول کہہ سکتے ہیں جو اُردو میں ہیں۔ یہ ناول ایک ایسے شخص کے ہاتھوں نکلے ہیں جس کا تعلق جمّوں و کشمیر سے تھا۔ محمد دین فوق کا ناول ''انارکلی'' ۱۹۰۰ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ یہ ایک تاریخی ناول ہے۔ اس ناول کے دیباچے میں ناول نگار نے لکھا ہے کہ یہ فرضی نہیں ہے اوریجنل ہے۔ اس کا پلاٹ ان کے ایک دوست نے چند انگریزی تواریخوں اور دیگر ذرائع سے انتخاب کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امتیاز علی تاج نے شہرہ آفاق ڈراما ''انار کلی'' نہیں لکھا تھا۔ محمد دین فوق نے کئی اور ناول بھی لکھے۔ ان میں ''ناکام ناصح''، ''شفق''، ''غریب الدیار''، ''نیم حکیم'' اور ''اکبر'' قابل ذکر ہیں۔ ''اکبر'' تاریخی ناول کا

درجہ رکھتا ہے۔ یہ ناول ''انارکلی'' کے دس سال بعد ۱۹۰۹ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ فوق کو اس بات کا یقین تھا کہ اس ناول کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ کیوں کہ لوگوں کو قدیم غیر حقیقی باتوں اور جنسی معاملات سے بڑی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ ناول انھوں نے قومی اور ملکی بہبودی کو مدِ نظر رکھ کر لکھا تھا تا کہ یہ ناول لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا لے۔

یہ وہی زمانہ تھا جب پریم چند کا اوّلین افسانوی مجموعہ ''سوزِ وطن'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔

یہاں پر اس بات کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ کہ یہ اُردو ناول کا ابتدائی دور تھا۔ اور ہمارے سامنے چند ضمنی نمونوں کے علاوہ کوئی قابل قدر ناول نہیں تھا۔ جو مغرب کے معیار کے مطابق پورا اُترے۔ یہ بات ویسے ہی صاف ہو چکی ہے کہ ریاست جمّوں وکشمیر کے کسی اخبار کی عدم اشاعت بھی ادب کے مختلف شعبوں کی طرف عدم توجہی کا بڑا سبب بنی۔ لیکن جب جمّوں خطے سے ہفت روز ''رنبیر'' شائع ہونے لگا تو کئی لوگوں نے لکھنا شروع کیا۔ اُردو ناول کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ اس اخبار کی مختلف اشاعتوں میں یہ لوگ اپنے ناول قسط وار چھپوانا شروع ہوئے۔ اس دور کے لکھنے والوں میں وشوا ناتھ درما، موہن لال ماوراہ، ناتھ ناظر اور کئی دوسرے نام قابلِ ذکر رہیں۔

اس دوران پنڈت نند لال بے غرض نے اپنا ناول ''تازیانہ عبرت'' کے

عنوان سے ایک ناول لکھا۔ جس کے کچھ قصّے بعد میں مقامی اخبارات میں شائع ہوئے ''وتستا''، ''ہمدرد'' اور ''مارتنڈ'' نے بھی اپنی ایک شاخ قائم کی تھی۔ اور اس طرح سے ہماری صحافی روایت کا بھی آغاز ہوا تھا۔ بے غرض کا یہ ناول رتن ناتھ سرشار کے ضخیم ناول ''فسانہ آزاد'' کے طرز پر لکھا گیا ہے۔۔ اور اس میں آغاز سے انجام تک ''فسانہ آزاد'' ہی کی طرح داستانی فضا قائم رہتی ہے۔

آزادی سے قبل ریاست جمّوں وکشمیر میں دو ناول نگار اُبھر کر سامنے آئے جن کی ادبی خدمات ریاست جمّوں وکشمیر کے ادبی حلقوں میں کبھی فراموش نہیں کی جائے گی۔ جب بھی ریاستی سطح پر اُردو فکشن کے حوالے سے بات کی جائے گی تو پریم ناتھ پردیسی اور راما نند ساگر کے نام سرِ فہرست ہوں گے۔ پریم ناتھ پردیسی نے افسانے کے علاوہ اُردو ناول میں بھی طبع آزمائی کی۔ ''پوتی'' ان کا ایک شاہکار ناول ہے۔ یہ ناول ۱۹۴۷ء کی افراتفری پر لکھا گیا تھا۔ راما نند ساگر حالاں کہ فلم ساز اور فکشن رائٹر کی حیثیت سے زیادہ جانے جاتے تھے۔ ان کا ایک مشہور ناول ''اور انسان مرگیا'' ہے یہ ناول ریاست جموں وکشمیر کے علاوہ پورے برصغیر میں شہرت حاصل کر چکا ہے۔ راما نند ساگر نے یہ ناول پہلے فساد اور امن کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ یہ ناول انتہائی ذہنی و جذباتی خلفشاری کے دوران ایک ہنگامی صورت میں فسادات کے موضوع پر لکھا گیا۔ یہ ناول کافی متنازعہ رہا ہے۔ جس کی بنیاد فرقہ وارانہ فساد ہے۔ خواجہ احمد

عباس نے اس کے پیش لفظ میں ساگر کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ ہنگامی لٹریچر نہیں ایک کلاسیک ہے۔اس قلم سے نکلے ہوئے الفاظ مرتی ہوئی انسانیت کی صدائے بازگشت ہے۔آپ خوب پہچان لیں گے کہ انسانیت کی مرنے کے بعد شکل کیا ہوتی ہے'' ۳؎

فسادات کے علاوہ اس ناول میں ترقی پسند تحریک کے عناصر بھی ملتے ہیں۔اور اس روایت کو آنے والے قلم کاروں نے بھی اپنایا۔اس دور تک آتے آتے برصغیر ہندو پاک میں ناول نگاری کے میدان میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ بہت سے ناول نگار پیدا ہوئے۔جنہوں نے اس صنف کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ناول نگار اپنے خیالات کو وسیع تناظر میں پیش کرنے کا ایک خاص وصف رکھتے تھے۔ پریم چند ایک کامیاب ناول نگار تصوّر کیے جاتے ہیں۔ان کے بعض ناول اُردو اور ہندی میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔''گئو دان''،''نرملا''،''گوشۂ عافت'' وغیرہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ان ناولوں سے اُردو ناول نگاری کے میدان میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔اس سے ہمارے یہاں ریاستی سطح پر بھی بعض ایسے ناول نگار پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے تخلیقی جوہر سے اس شعبے میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ چنانچہ ان میں پریم ناتھ پردیسی، تیج بہادر بھان، کشمیر لال ذاکر، نرسنگھ داس نرگس، ٹھاکر پونچھی

وغیرہ جیسے ناول نگار سامنے آئے۔

پریم ناتھ سادھو رونق نام کے ایک نوجوان قلم کار اُردو کے ادبی حلقوں میں گزرے، کہیں ادبی حلقوں میں رہ کر پریم ناتھ پردیسی کے نام سے زیادہ مشہور ہوئے۔ پریم ناتھ پردیسی کشمیر کے بڑے فکشن نگار تھے۔ جنھوں نے ادبی حلقوں میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ شروع شروع میں وہ رابندر ناتھ ٹیگور اور پریم چند کے رومانی افسانوں سے بھی متاثر تھے۔ پردیسی ایک حقیقت نگار تھے۔ وہ سماج کی حقیقی تصویر کو کاغذ پر اتارنے میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز اور پھر خود یہاں کے سیاسی حالات نے پردیسی کو پہلی بار احساس دلا کر انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ضائع کر دیا۔ وقت کی آہٹ کو سن کر انہیں اپنی فرض شناسی اور کم مائگی کا اندازہ ہوا۔ انہوں نے اس بات کا اعتراف خود بھی کیا ہے۔

پردیسی نے نہ صرف استحصال پر لکھنا شروع کیا بل کہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک ادبی انجمن تشکیل دی۔ جس کا نام ''حلقہ اربابِ ذوق'' تھا۔ اس انجمن کا تعلق حلقۂ اربابِ ذوق لاہور کے ساتھ نہیں تھا بل کہ کشمیر کے ساتھ تھا۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ کشمیر کے نوجوانوں کا یہ چھوٹا سا حلقہ پردیسی کے گھر میں ادبی نشستیں قائم کرتا۔ اس حلقے میں مشہور فلم ساز رامانند ساگر بھی شرکت کرتے۔ یہ فلم ساز اور ہدایت کار بھی تھے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ انہوں نے پریم

ناتھ پردیسی کو ترقی پسند تحریک کی شاخ کھولنے کو کہا اس طرح سے ریاست جمّوں وکشمیر میں بھی ترقی پسند تحریک کی ایک شاخ قائم ہوگئی۔اوراس کے زیراثر کام ہونے لگا۔اس طرح ترقی پسند تحریک کا باضابطہ طور پرآغاز ہوا۔اوراس کا دفتر پردیسی کا مکان تھا۔آہستہ آہستہ یہ حلقہ پھیلتا گیااور نوجوان فن کاروں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔اس سے اس تحریک کے پنپنے کی فضا تیار ہوئی۔اس چھوٹی سی انجمن نے ریاست جمّوں وکشمیر میں ایک ہمہ گیرادبی تحریک کی شکل اختیار کرلی۔

پردیسی نے اپنی تخلیقات میں انسان دوستی،زندگی اورامن ودوستی کا پیغام دیاہے۔اس سے پردیسی کوکشمیر کا پریم چند بھی کہاجاتا ہے۔انہوں نے ۱۹۴۷ء سے قبل ایک ناول ''پوتی'' کے عنوان سے لکھا۔یہ ناول لاہور سے شائع ہوا۔تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔خط وکتابت کا سلسلہ ٹوٹ گیا جس کی وجہ سے اس ناول کے بارے میں کوئی اطلاع موصول نہیں ہوسکی۔

کشمیری لال ذاکر کسی تعارف کامحتاج نہیں ہے۔یہ اُردو کے ایک مشہور ومعروف ناول نگار گذرے ہیں جن کا تخلیقی سفرایک لمبے عرصے پرمحیط ہے،ذاکر نے اپنا ادبی سفرشاعری سے شروع کیا۔لیکن بعد میں وہ نثر کی طرف راغب ہوگئے۔افسانہ اور ناول کواپنی جولاں گاہ بنایا۔وہ خاکہ نگاری میں بھی کمال رکھتے ہیں۔وہ کشمیر کے پس منظر میں ناول لکھنے کا ایک خاص فن رکھتے ہیں۔اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ وہ کشمیر

میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ ''سیندور کی راکھ''، ''سمندر، صلیب اور وہ''، ''کرماں والی''، ''انگھوٹے کا نشان''، ''دھرتی سدا سہاگن''، ''لمحوں میں بکھری زندگی''، ''خون پھر خون ہے''، ''جاتی ہوئی رُت''، ''ڈوبتے سورج کی کتھا''، ''چھٹی کا دودھ''، ''چار میل لمبی سڑک'' اور ''آدھے چاند کی رات'' وغیرہ ان کے اہم ناول ہیں۔

کشمیری لال ذاکر کا ناول ''سمندر صلیب اور وہ'' گوا کی تحریکِ آزادی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس ناول کو ہم کشمیر کے پس منظر میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ناول کافی مشہور ہوا۔ یہ ایمرجنسی پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ ان کا ایک ناول ''خون پھر خون ہے'' کافی عمدہ ناول ہے۔ ''جاتی ہوئی رُت'' ناول میں مرد کو اولیت دیتے والے سماج میں کسی طرح عورت دوسرے درجے کی تیسری چیز مانی جاتی ہے۔ ان کا یہ ناول سماج پر ایک طنز ہے کہ عورت کو آج بھی کس استحصال سے گزرنا پڑتا ہے۔

کشمیری لال ذاکر کے ناول میں کشمیر کی خوشبو نظر آتی ہے۔ وہ سماج کے اندر پھیلی بدعنوائیوں کو دور کرنا چاہتے تھے۔ رشوت خوری اور مذہب کے نام پر استحصال ان کے عزیز ترین موضوعات ہیں۔ وہ شروع سے ہی صاف ستھرے ماحول کے خواہاں رہے ہیں۔ ان کے دل میں صحیح معنوں میں انسان کے درد و کسک کی لہر تھی۔

ذاکر ہمیشہ دردمندانہ بات کرتے اور ناولوں میں کردار بھی اسی قسم کے تخلیق کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں ہندو مسلم برادری، قومی ایکتا اور وطن کی محبت کے

موضوعات پر محیط ہے۔ ذاکر کے ناولوں میں کشمیر کی منظر کشی شدومد کے ساتھ ملتی ہے۔ اُن میں رومان کی ہلکی پھلکی جھلکیاں ملتی ہیں۔لیکن ان کے اکثر ناول یہاں کے محنت کش عوام کی ترجمانی کرتے ہیں۔ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب میں ذاکر کے ناولوں میں موضوع کی تنوع پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان میں سے کئی ناول کشمیر کے پسِ منظر میں ہیں۔
ذاکر کا فکشن ہئیت کے نئے تجربوں کے باعث نہیں
اپنے متنوع موضوعات سے بھی اہم ہیں۔ان کے
ناولوں میں انسانی زندگی کے بالکل باطن کی بے چینی
کا شدید احساس ہوتا ہے اور سماج اور معاشرے کی وہ
بدصورتی بھی جس نے غم اور ملال کا زہر گھول دیا ہے
کھل کر بے نقاب ہوجاتی ہے۔''[۴۴]

غرض کشمیری لال ذاکر وہ ناول نگار ہیں جنہوں نے اس صنف کو فروغ دینے میں اپنا خونِ جگر صرف کیا۔اس طرح انہوں نے متعدد ناول لکھ کر ریاست جمّوں وکشمیر کے ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

نرسنگھ داس نرگس ایک اچھے اور اعلیٰ پائے کے صحافی کے طور پر جانے جاتے تھے۔ وہ ایک بہترین افسانہ نگار، مورخ اور ناول نگار کے طور پر بھی ادبی حلقوں

میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ وہ ایک عرصہ تک ہفتہ روزہ ''چاند'' بھی پابندی کے ساتھ نکالتے تھے۔ ڈوگرہ شاہی تحریک کا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ نرگس کے تین ناول شائع ہوئے۔ ان میں ''پاربتی''، ''نرملا'' اور ''جانکی'' کے نام اُن کے ناولوں کے اہم نام ہیں۔ وہ پریم منوہر، ممولا ل کوئی اور دیس التحریر کے ناموں سے بھی لکھتے تھے۔ ایسے ناولوں میں اکثر کردار مظلومیت اور استحصال کے شکار اُن بے زبان کرداروں سے متعارف ہوتے ہی منشی پریم چند کے ناول کی یاد آتی ہے۔ مثلاً ''پاربتی'' ناول میں منشی پریم چند کے ناول کا مزاج خوب ملتا ہے۔ غالباً اس کے طرز پر تحریر کیا گیا ہے۔ یہ ناول ۱۹۶۲ء میں اپنے ''چاند پریس'' میں شائع کرایا گیا۔ اس سے قبل ''جانکی'' اور ''نرملا'' دو ناول اسی پریس سے شائع ہوئے۔ یہ مظلوم اور جابر دیہی خواتین کی تصویریں ہیں جو اپنی عیسائی کے باوجود سماج کی سنگین چٹانوں سے ٹکر لینے ک عزم رکھتی ہیں۔

نرسنگھ دنرگس اس دیہات میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ اس سے ان کے ناولوں میں دیہاتی ماحول کا عکس جگہ جگہ ملتا ہے۔ لوگوں کی کم پرسی اُن کی اقتصادی حالات اور اُن کے رسم ورواج کے ساتھ ساتھ اُن کے ناولوں میں ڈوگرہ کلچرل تہذیب اور تمدن کی بھرپور جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو نرسنگھ داس نرگس اپنے دور کے کامیاب ناول نگار تھے۔ پلاٹ کی خوبصورتی، زبان و بیان کی سادگی اور جذبات کی لطافت نرگس کے ناولوں کا حصّہ ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی نرسنگھ داس نرگس کی

ناول نگاری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''انہوں نے اپنے ناولوں میں سماجی مسائل کو اپنا موضوع بنایا اور سماج کی بدعنوانیوں کی تصویر کشی کی۔ نرسنگھ داس نرگس خاص طور سے دیہاتوں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے چونکہ عمر عزیز کا بیشتر حصّہ دیہاتوں میں گزارا ہے۔ اس سے ان کے ناولوں کے کردار ایسے لوگ ہیں جو رسم ورواج کی چھوکھٹ پر قربان ہونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ نرسنگھ داس نرگس اپنے ناولوں میں اپنے اصلاحی مقصد کو پیش کرتے ہیں۔''۵

نرسنگھ داس نرگس کے بعد ریاست جمّوں وکشمیر کے ناول نگار جنہوں نے ترقی پسند تحریک کا اثر قبول کیا ہے۔ یا پھر ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ یا ادب کی خدمت کی ہے۔ ان میں ٹھاکر پونچھی کا نام سرِفہرست ہے۔ ٹھاکر پونچھی خطۂ جمّوں سے تعلق رکھنے والے ایک اہم ناول نگار ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ ''راجہ'' اُن کا پہلا افسانہ تھا۔ وہ ایک بلند پایہ ناول نگار تھے۔ اُن کے بہت سے ناول شائع ہوکر منظر عام پر آ چکے ہیں اور ادبی حلقوں میں مقبولیت بھی حاصل

کر چکے ہیں۔ ''رات کے گھونگھٹ''، ''وادیاں اور ویرانے''، ''شمع ہر رنگ میں ملتی ہے سحر ہونے تک''، ''چاندنی کے سائے''، ''یادوں کے کھنڈر''، ''پیا سے بادل''، ''چاندی کے ہاتھ پٹ''، ''جھڑ کے بچھڑے''، ''گونگے ہونٹ''، ''اب میں وہاں نہیں رہتا''۔

ٹھاکر کا پہلا ناول ''رات کے گھونگھٹ'' ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کی مقبولیت کے بعد انہوں نے لگا تار لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ٹھاکر پونچھی کے ناول فنی نقطۂ نظر سے مکمل ناول ہیں۔ انہیں ناول کے فن پر پوری دسترس حاصل تھی۔ ٹھاکر پونچھی کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے منصور احمد منصور لکھتے ہیں:

> ''ٹھاکر پونچھی صحیح معنوں میں ناول کے فن کار ہیں۔ انہیں ناول کے فن پر عبور بھی ہے اور زبان پر دسترس حاصل ہے۔ وہ نفسیات کی باریکیوں کو بڑی چابکدستی سے پیش کرنے کا ہُنر جانتے ہیں۔ وہ بڑی خوبصورتی سے دیہاتی اور شہری زندگی کے ہر مرقعے پیش کرتے ہیں۔ سماجی اور نفسیاتی مسائل بھی ان کے ناولوں میں جھلک دیتے ہیں۔''[۶]

ٹھاکر پونچھی اُردو کے مشہور و معروف ناول نگار کرشن چندر سے کافی متاثر تھے۔ وہ رنگا رنگ موضوعات برتنے کے قائل تھے۔ پلاٹ کی چابکدستی، کرداروں کی رنگا

رنگی اور موضوعات کی خوبصورتی ان کے ناولوں میں بدرجہ اُتم پائی جاتی ہے۔ انہوں نے رومانی قصّوں اور کہانیوں سے اپنا سفر شروع کیا۔ عشق و محبت کی پاسداری، زبان و بیان کو محاسن اور تشبہات و استعارات کا برمحل استعمال ان کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔

وہ ہمیشہ سماج کے زوال پذیر معاشرے کا عکس اپنے ناولوں میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک منجھا ہوا اسلوب ملتا ہے۔ وہ خوبصورت زبان کے مالک تھے۔ ٹھاکر پونچھی نے اپنے ناولوں میں عوام کو حقیقت سے روشناس کرایا۔ وہ حقیقت پسند تھے۔ اور سیدھے راستے پر چلنے کا درس دیتے تھے۔ ٹھاکر پونچھی کی منظر کشی کا کوئی جواب نہیں۔ ان کے ناولوں میں استعارات و تشبہات کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ ٹھاکر پونچھی کردار نگاری اور ڈراما نگاری کا ہُنر خوب جانتے ہیں۔ ان کے ناولوں کے کردار خوبصورتی سے اپنا رول نبھانے کے فن میں ماہر ہیں۔ یہی خصوصیت ان کو معتبر ناول نگار بنا دیتی ہے۔ ریاست جمّوں و کشمیر کے دوسرے ناول نگاروں کی طرح ٹھاکر پونچھی بھی ایک اہم ناول نگار ہیں۔

ترقی پسند دور کے ایک اہم ناول نگار جو ریاست جمّوں و کشمیر کے ادبی حلقوں میں شمار ہوتے ہیں ان کا نام تیج بہادر بھان ہے۔ بھان کا نام ناول نگاری میں ایک اہم نام ہے۔

تیج بہادر بھانؔ سرینگر کے ایک کشمیری پنڈت گھرانے سے تعلق رکھتے

تھے۔ اُن کی ابتدائی کہانیاں سرمایہ دار کا خواب، لالہ چُنری جو ۱۹۵۱ء کے دور میں لکھی گئی۔ یہ حقیقت نگاری اور سیاسی مسائل پر مبنی ہیں۔ ''سیلاب اور قطرہ'' کے عنوان سے اُن کا ایک خوبصورت ناول ہے۔ جہاں تک تیج بہادر بھان کے اس ناول کا تعلق ہے تو یہ ولر جھیل سرینگر کے اطراف کی سرزمین اور مناظر کے درمیان ایک غریب خاندان کی داستان ہے۔ ولر کے کنارے پانی میں پو پھٹنے سے تلے پوری سے سنگھاڑے جمع کرنے والی ایک غریب اور مفلوک الحال لڑکی ''پھول اور گارڈ عبدالاسلام کے اس سے جذباتی اور جسمانی استحصال کی کہانی ہے۔ جس کو بڑے فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بھانؔ نے اس کہانی میں نفسیات کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح بھان کا یہ ناول ایک حقیقت پسندانہ ہے اور کسی حد تک ایک نفسیاتی مطالعہ اور کشمیر کی فضا کے پس منظر میں ایک نچلے طبقے کی زندگی کے واقعات کا ایک دلچسپ نقشہ کھینچتا ہے۔

ناول نگاری کے فروغ میں علی محمد لون کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ لون کی ولادت ۱۹۲۷ء میں کشمیر میں ہوئی۔ یہ ایک اچھے اور بلند درجہ ڈراما نگار تھے۔ ڈراموں کے علاوہ افسانے بھی تحریر کیے ہیں۔ علمی اور ادبی دنیا میں انہیں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ لون ایک قابل قدر ناول نگار تھے۔ اُن کا ناول ''شاید ہے آرزو تیری'' ۱۹۶۲ء میں جمّوں سے شائع ہوا۔ اس ناول میں دہلی میں رہنے والے کشمیریوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ اس ماحول میں کشمیر میں آئے ہوئے نوجوان کے نا مساعد

حالات کے شکنجے میں پھنس کر اپنے ماضی کو یاد کرتے ہیں۔ ''جہاں میں رہتا ہے''، ''اور ایک دریا''، علی محمد لون کے قابلِ مقبول ناول ہیں۔

ناول نگاری سے ہر دور میں تخلیق کاروں کی دلچسپی رہی ہے۔ اگر چہ بہت کم ناول منظرِ عام پر آئے۔ لیکن یہ ناول اپنے مواد اور موضوع کی بدولت ناول کی وسیع دنیا آباد کیے ہوئے ہیں۔ اس دور میں بھی فن کار افسانہ اور شاعری کی طرف زیادہ مائل نظر آرہے تھے۔ لیکن اُردو ناول پر بھی اُن کا دھیان رہا۔ اور اسی وجہ سے اس دور میں اچھے اور بلند درجہ ناول لکھے گے۔ ۱۹۵۸ء میں مالک رام آنند کا ناول'' خدا'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس ناول کو بھی ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔ اس کے بعد'' دہکتے پھول''، ''شبنم آنکھیں''، ''صلیب اور دیوتا'' اور'' اپنے وطن میں اجنبی'' شامل ہیں جن کی اہمیت اُردو ادب میں مسلم ہے۔

حامدی کاشمیری ایک معتبر شاعر، قابلِ قدر نقاد اور محقق کے طور پر جانے جاتے ہیں لیکن انہوں نے ادب کی دوسری اصناف یعنی ڈراما نگاری، افسانہ نگاری کے علاوہ ناول نگاری میں بھی اپنا مقام بنایا۔ حامدی کاشمیری شروع شروع میں ترقی پسند تحریک کے ساتھ رسمی طور پر وابستہ تھے۔ اس سے ان کے یہاں ترقی پسند تحریک کا غیر واضح اثر نظر آتا ہے۔ لیکن اس تحریک سے کوئی ذہنی وابستگی پیدا ہونے کے باعث وہ اپنے فن میں کوئی نظریاتی بنیادیں قائم نہ کر سکے۔ اس کے برعکس ان کے ناولوں میں

آس پاس کی زندگی کا اثر تو ملتا ہے ۔لیکن حد درجہ رومانی ہے ۔کئی برس کے بعد انہوں نے اس راہ کو ترک کر کے تجربات کو نثر کے مختلف رسائل سے سنوارنے کی کوشش کی ہے ۔حالاں کہ جُوں جُوں وقت گزرتا گیا اُن کے ذہن میں پختگی پیدا ہوتی گئی ۔مطالعے اور مشاہدے کی گہرائی نے انہیں سماجی اقدار کی پامالی کا احساس دلایا۔اور رشتوں کی شکست وریخت اور دوہری شکست کی نفسیات اُن کے محبوب موضوعات بن گے ۔

پروفیسر حامدی کاشمیری نے ناول نگاری میں اپنا ایک الگ مقام پیدا کیا ۔اُن کے ناول ''بہاروں میں شعلے''،''بلندیوں کے خواب''،''برف میں آگ''،''اپنے وطن میں اجنبی''،'' نئے دن پرانے سال''،''شبنم آنکھیں''،''پائل کے زخم''اور''نیلی جھیل کالے سائے''ان کے رومانی ناول ہیں ۔یہ تمام ناول ادبی حلقوں میں اپنا نام پیدا کر چکے ہیں ۔''پرچھائیوں کا شہر''ان کا ایک ناولٹ ہے ۔ادب کے اس میدان میں بھی اپنی فنکارانہ چابکدستی سے چھاپ ڈال چکے ہیں ۔حامدی کاشمیری کے نظریات میں بعد کے برسوں میں بہت ساری تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔ان کے ناولوں میں ترقی پسندی کی چھاپ نظر آتی ہے ۔وہ کرشن چندر ، بیدی ،عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی سے متاثر تھے ۔وہ منشی پریم چند سے بھی کافی حد تک متاثر نظر آتے ہیں ۔انہوں نے رومانی دور کے فنکاروں کے فن کا اعتراف بھی کیا ہے ۔''بلندیوں کے خواب''،''بہاروں میں شعلے''اور''برف میں آگ'' جیسے اُن کے ناول ہیں خوابوں کی دنیا نظر آتی ہے ۔لیکن

اس کے ساتھ ساتھ وہ انسانی زندگی کی کہانیاں بھی صفحۂ قرطاس پر لانے کے روادار ہیں۔ اس طرح سے خواب اور حقیقت کا امتزاج حامدی کے ناولوں میں بخوبی پہچانا جا سکتا ہے۔

''پرچھائیوں کا شہر'' میں ناول نگار ایک نئی فکر کو لے کر نظر آتے ہیں۔ اس ناول میں عصری آگاہی کا شعور بھی ملتا ہے۔اور ترقی پسند رُجحان بھی۔ وہ انسان کا درد کھل کر بیان کرتے ہیں اور اپنی بات صاف اور واضح الفاظ میں قارئین تک پہنچاتے ہیں۔

ریاست جمّوں وکشمیر کے دوسرے ناول نگاروں کی طرح نور شاہ بھی ناول نگاری میں اپنا الگ مقام رکھتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔لیکن انہوں نے ڈرامے اور خاکے بھی لکھے ہیں جن کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ وہ ایک قابلِ قدر ناول نگار بھی ہیں۔ جنہوں نے اپنے ناولوں میں کشمیر کی خوبصورتی کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ یہی نہیں بل کہ وہ ایک حقیقت نگار بھی ہیں۔ وہ فوق فطری قصّے اور کہانیوں پر یقین نہیں رکھتے۔ان کے ناول میں سماج کا متوسط طبقے کی نمائندگی کا بھرپور استعمال کیا ہے۔اُن کے یہاں کشمیر کے حقیقی کرداروں کی چہل پہل ملتی ہے جن میں حاجی بھی ہیں کسان اور مزدور بھی۔ مظلوم بھی ہیں، سیاسی کارکن۔ ''نیلی جھیل کالے سائے''، ''پائل کی زنجیر'' ان کے دو ناول ہیں۔جن میں کشمیر کی ہری بھری اور شاداب وادی کا حسن ملتا

ہے۔نور شاہ کے قلم میں جادو ہے۔وہ بات کو گھما پھرا کر کہنے کے قائل نہیں بل کہ اُن کے ناولوں میں خوبصورت منظر کشی کے ساتھ ساتھ سماج میں رستہ ہوادرد بھی نمایاں طور پر ملتا ہے۔،اُن کا ناولٹ ''آ وسو جائیں'' بھی انسانی دردو کرب کی ان گنت ٹیسیں اُجاگر کرتا ہے۔

ریاست جمّوں وکشمیر کے ناول نگاری میں بھی ادب کی بدلتی ہوئی رو کے اثرات پیدا ہو گے۔ یہاں کے ناول نگار اپنی ماضی کی شاندار روایت کو ملحوظِ خاطر رکھنے میں کامیاب ہوئے ۔ جدید رُجحانات کے باوجود یہاں کے ناول نگار کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور قرۃ العین حیدر کے اثرات سے دامن نہ بچا سکے۔ بقول قمر رئیس ''نیا ادب اُسی عرفان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ حالاں کہ تلاش میں وہ سب سے پہلے ماضی کو دریافت کرنا چاہتا ہے۔'' ریاست کے بعض ناول نگار ایسے بھی ہیں جو روایت کو آگے بڑھانے میں پیش پیش رہے ہیں اور جدید میدان کو بھی محلوظِ خاطر لایا۔ان میں سے چند ناول نگار اگر چہ وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ بدل گئے ۔اور نئے نئے ٹکنیکی تجربے کرنے شروع کیے۔لیکن دوسری طرف ناول کے اصولوں اور فارمولوں سے مکمل طور سے کنارہ کش نہیں ہوئے ۔ان کے ناولوں میں کہانی پن برقرار ہے۔ ایسے ناول نگاروں میں کرن کاشمیری، مالک رام، فاروق رینزو، ڈی کے کنول، آنند لہر ،جان محمد آزاد، رشید پروین، پرویز مانوس وغیرہ ہیں۔

جان محمد آزاد کے ناول بے پناہ دلچسپی کے حامل ہیں۔آزاد کرشن چندر سے کافی متاثر ہیں۔انہیں زبان پر قدرت حاصل ہے۔وہ اپنے ہی ارد گرد ماحول سے اپنی کہانیوں کا تانا بانا اخذ کرتے ہیں۔اور پھر اپنے ناولوں میں ویسے ہی پیوست کرتے ہیں کہ ایک حقیقی دنیا سامنے آجاتی ہے۔''کشمیر جاگ اُٹھا''،''وادیاں بلا رہی ہیں''،اور ''برفیلے لمحوں کا جنگل'' اُن کے تین ناول ہیں۔ان کے تین ناول علامتی ہیں۔اور کشمیر کے سرسبز وشاداب وادیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔وہ کشمیر سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔اسی سے اُن کے ناولوں میں کشمیر کا کلچر تہذیب اور تمدن کا عکس صاف طور سے نمایاں نظر آتا ہے۔ڈاکٹر برج پریمی آزاد کے اس ناول پر تبصرہ کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

> ''جان محمد آزاد کا اسلوب شاعرانہ ہے۔اس میں اگرچہ کرشن چندر کے اسلوب کی چھاپ ہے۔اور کہیں اسراف الفاظ نے خواہ مخواہ کی طوالت پیدا کی ہے۔لیکن پس منظر کی فن کارانہ پیش کش یقیناً قابلِ داد ہے۔بعض ٹکڑے قابل دستک حد تک خوبصورت ہیں ۔ جان محمد آزاد جذباتی کیفیات اور نفسیاتی ہیجانات کی تصویر کشی پر قدرت رکھتے ہیں اور بعض

نازک مرحلوں پر کامیابی سے اپنی اس خصوصت کو
منواتے ہیں۔''ے

''وادیاں بلا رہی ہیں'' جان محمد آزاد کا اولین ناول ہے۔ جو انہوں نے اپنے عزیز دوست عمر مجید کی مشاورت سے شائع ہے۔ وہ اپنے اس ناول میں نادیدہ مقامات کی سیر کراتے ہیں۔ اور دلکش اور دل پذیر مناظر کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ آزاد نے یہ کہانی جذباتی انداز میں لکھی ہے۔ اور بقول حامدی کشمیری اس میں تخیل آرائی، منظر نگاری، جذباتی کیفیات کی مصّوری اور زبان و بیان کی حسن کاری بدرجہ اُتم ملتی ہے۔

ریاست جمّوں و کشمیر میں دیگر ناول نگاروں کے ساتھ ساتھ آنند لہر کا نام بھی سرِفہرست ہے۔ شام سندر آنند لہر کا شمار ریاست کے اعلیٰ اور اچھے ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے افسانوں کے ساتھ ساتھ بعض ایسے ناول بھی لکھے جو ادبی حلقوں میں خاصے بحث کا موضوع بن چکے ہیں۔ ''اگلی عید سے پہلے''، ''سرحد کے بیچ''، اور مجھ سے کہا ہوتا، اُن کے بعض کامیاب ناول ہیں۔

''مجھ سے کہا ہوتا'' اُن کا تازہ ترین ناول ہے جس میں انہوں نے ایک نئی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ ناول میں کوئی انسانی کردار نظر نہیں آتا ہے۔ بل کہ ناول نگار نے جانوروں اور پرندوں کی گفتگو سے انسانی مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش

کی ہے۔

آنندلہر ایک حساس فنکار ہیں وہ دراصل عراق اور امریکہ کی جنگ سے ہونے والی تباہ کاری سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اسی لئے انسانیت کا طاقت ور بننے کے لئے غریب اور پسماندہ قوموں کا استحصال اور اٹیم بموں اور ہائیڈ ورجن بموں کے استعمال سے دنیا میں پیدا ہونے والے مسائل قدرتی وسائل کی کمی، ماحول کی آلودگی اور کئی ایسے سوالات ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں اُبھرتے ہیں۔ یہ عام سوالات نہ صرف انسان سے جواب طلب کرتے ہیں بل کہ عام انسانی رشتوں پر چوٹ بھی کرتے ہیں۔ آنندلہر نے اُن کے مسائل کو پہلی بار محسوس کیا ہے اور اپنے ناولوں میں طنزیہ لب و لہجے میں اُن تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہے۔ اُن کے دوسرے ناولوں میں بھی یہی لب و لہجہ ملتا ہے۔ ''اگلی عید سے پہلے'' اور ''سرحد کے بیچ'' آنندلہر کی زندگی کے دو اہم پڑاؤ ہیں جن میں وہ انسان کو انسان ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ وہ جنگ و جدل قتل و غارت اور ملکی فسادات کے خلاف ہیں۔ اُن کے فن میں ایک علامت ہے۔ اس علامت کے ذریعے سے وہ امن بھائی چارہ محبت اور خلوص کا جذبہ عام کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے مطابق ملکوں میں تقسیم ایک فرضی لطیفہ ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ انسانیت عالمی برداری، اخوت اور بھائی چارے سے دعا کرتے ہیں۔ وہ اپنے ناولوں میں امن وشانتی کی اپیل کرتے ہیں۔

جدید خواتین ناول نگاروں میں ترنم ریاض کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ افسانہ بھی لکھتی ہیں اور شاعری بھی کرتی ہیں۔لیکن ناول نگاری کے اعتبار سے اُن کی حیثیت مسلم ہے۔

وہ اُردو فکشن کے حوالے سے علمی اور ادبی دنیا میں اپنا لوہا منوا چکی ہیں۔ اُن کا ناول ''موری'' اپنی ایک انفرادی پہچان رکھتا ہے۔اس ناول میں انہوں نے ناول نگار خواتین کے مسائل کو اُبھارا ہے۔ترنم ریاض ۱۹۹۰ء کے دوران کشمیر کی تباہ کاریوں کی تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔وہ بندوق کے نوک پر بے بس اور لاچار عوام پر ہوئے ظلم وستم کی عین گواہ ہیں۔اور وہ کشمیر کے لاکھوں کی تعداد میں ہجرت کرنے والے لوگوں کی بے بسی خاص طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ترنم ریاض نے ہمیشہ عوام کے دکھ درد کو اپنی تخلیقات میں سمیٹا ہے۔اُن کے قلم سے ہمیشہ ظالم اور جابروں پر طنز کے نشتر برستے ہیں۔اُن کا ناول ان تمام چیزوں کی تصویر کشی کرتا ہے۔

ریاست کے دوسرے فن کاروں کی طرح مالک رام آنند کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔وہ فکشن کے علاوہ شاعری میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔انہوں نے ناول نگاری میں اُردو دنیا میں اپنا لوہا منوایا ہے۔''دہکتے پھول شبنم آنکھیں''،''اپنے وطن میں اجنبی''،''نئے دن پرانے سال''اُن کے بعض اہم اور قابل ستائش ناول ہیں۔اُن کا ناول ''اپنے وطن میں اجنبی''ایک جاندار ناول ہے۔جس میں تکنیک کے نئے تجربے

ملتے ہیں۔اس میں انہوں نے چشمہ مصّور کی تکنیک برتی ہے۔ان ناول نگاروں کے علاوہ اور بھی بہت سے ناول نگار ہیں، جو ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ مذکورہ ناول نگاروں کے ہاں کہیں نہ کہیں ترقی پسند تحریک کے اثرات ضرور ملتے ہیں۔ کچھ ناول نگاروں کے ناولوں میں مکمل طور سے ترقی پسند تحریک کی تکنیک کا تجربہ ملتا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں ترقی پسند تحریک ۱۹۳۶ء سے شروع ہوئی تھی ملک بھر میں یہ تحریک زوروں پر تھی اور ریاست کے فن کار بھی اس تحریک کا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکے۔تمام ناول نگاروں نے اس تحریک کو قبول کیا اور بے حد متاثر بھی ہوئے ۵۸۔۱۹۵۷ء کے بعد یہ تحریک آہستہ آہستہ دھیمی پڑنے لگی۔اور اس میں وہ دم نہیں رہا جو ابتدا میں تھا۔یہ صورت پورے ہندوستان میں ترقی پسند تحریک میں پیدا ہوگئی۔یہی حالات ریاست جمّوں وکشمیر میں بھی ہوئے۔

کشمیر میں ترقی پسند تحریک ایک اہم اور ادبی تحریک اُبھر کر سامنے آئی۔ اس تحریک نے کشمیر میں ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت صورت اختیار کر لی تھی۔ اس تحریک نے نہ صرف یہاں کے اُردو ادب پر اپنے اثرات مرتب کیے بل کہ یہاں کے ڈوگری اور کشمیری ادب پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے۔اس لئے کشمیر میں ادب کا کوئی سنجیدہ قاری اس تحریک کے تاریخی رول کو حذفِ نظر نہیں کر

سکتا۔

حواشی

۱۔ڈاکٹر پریمی رومانی   فکرونظر   رچناپبلی کیشنز جموں   ۲۰۱۲ء   ص،۱۳۹

۲۔عبدالقادر سروری   کشمیر کے دو ادیب دو بھائی   ص،۱۱۷

۳۔ڈاکٹر برج پریمی   جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما   ص،۴۳

۴۔ایضاً ص،۴۵

۵۔ایضاً ص،۴۴

۶۔منصور احمد منصور   جموں و کشمیر ادب کے پچاس سال   ص،۱۸۰

۷۔ڈاکٹر برج پریمی،   مباحث۔   ص۔۱۷۲

﴾... ☆☆☆☆ ...﴿

باب پنجم

﴿... غیر افسانوی ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات ...﴾

فنونِ لطیفہ ادب کی اہم ترین شاخ ہے۔ جو خیال اور مواد کی ترتیب و الفاظ کے موزوں و حسین استعمال کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ یہ تخلیقی عمل اُردو میں دو مختلف طریقوں سے کام کرتا ہے۔ ان میں سے ایک کو افسانوی ادب اور دوسرے کو غیر افسانوی ادب کہا جاتا ہے۔ جس تحریر میں قصّہ اور کہانی کا انداز اپنایا جائے وہ افسانوی ادب ہوتا ہے۔ اور ایسی تحریر جو قصّہ کہانی کے بجائے حقیقت پر مبنی ہوں انہیں غیر افسانوں ادب کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ افسانوی ادب کے کردار اور واقعات فرضی ہوتے ہیں۔ جب کہ غیر افسانوی ادب کی بنیاد حقیقت اور واقعیت پسندی پر رکھی جاتی ہے۔ اس میں دُنیا کی حقیقتوں، مسائل، تجربات، مشاہدات اور احساسات کو کہانی کے رنگ دیے بغیر پیش کیا جاتا ہے۔ غیر افسانوی ادب کی اصناف مضمون، دیباچہ، سفرنامہ، خاکہ، سوانح، انشائیہ، خودنوشت اور رپورتاژ ہیں۔

ادبی و شعری نشستوں کے اہتمام کے ساتھ جمّوں سے ملک راج صراف اور کشمیر سے پریم ناتھ بزاز نے بالترتیب 1924ء اور 1934ء میں ''رنبیر'' اور ''وتستا'' کے نام سے دو اخبار جاری کیے۔ اس طرح سے یہاں کے ادبی فضا کو ایک

نئ روشنی ملی۔اس دور میں یہاں کے ادبی اُفق پر محمد دین فوق، چراغ حسن حسرت، اور دیگر قلم کار ایک کہکشاں کی مانند چمکتے ہوئے نظر آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جمّوں وکشمیر میں افسانوی اور غیر افسانوی نثر کے عمدہ اور قابل ذکر نمونے سامنے آنے شروع ہونے لگے تھے۔

پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ درد نے افسانے کی دُنیا میں اپنا لوہا منوایا اور چراغ حسن حسرت کے علاوہ تیرتھ کاشمیری اور گنگا درد دیہاتی نے اُردو کے غیر افسانوی ادب میں اپنے رنگوں کی ایک قوس قزح بکھر دی۔ تقسیم کی وجہ سے قلم کار بکھر گے اور ہندو پاک کے مختلف علاقوں میں جاگزیں ہونے لگے۔ اس صورتِ حال میں غیر افسانوی ادب کی راہیں بھی مسدرد ہوگئ۔ غیر افسانوی ادب میں جن قلم کاروں نے رنگ بھرے ان میں پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر زماں آزردہ، غلام نبی خیال، سوم ناتھ زتشی، شمیم احمد شمیم وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان قلم کاروں نے سفر نامے انشائیوں، خاکوں، رپوتاژ وغیرہ سے غیر افسانوی ادب کے دامن کو نہ صرف پھیلایا بل کہ اس میں گل بوٹے بھی کھلائے۔

غیر افسانوی ادب میں سب سے پہلے ہم انشائیہ کوموضوع بحث بنائے گے۔ انشائیہ کا ذکر کریں تو ریاست جموں وکشمیر میں انشائیہ لکھنے والوں کی ایک لمبی قطار موجود

ہے۔ان میں شیخ محمد عبداللہ، سید میر قاسم، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر زماں آزردہ، سید علی شاہ گیلانی وغیرہ کے اسمائے گرامی خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں۔

اس صنف کی مقبولیت میں اور بھی بہت نام شامل ہیں جنہوں نے اپنی شہرت کا ڈنکا بجایا۔ غلام قادر، عزیز کاشمیری، غلام نبی، جگن ناتھ گوردھن سنگھ، ہنس راج ہنڈنوترا، وشوناتھ کھجوریہ، نواب محمد بٹ، بنسی لال رینہ، بلدیوراج شاستری، ڈاکٹر شری دوم، محمد ابراہیم، غلام محمد مشتاق، غلام نبی صراف، رشید نازی، اوتار کرشن رہبر، عبدالسلام اور تاراچند بسمل وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ مذکورہ انشائیہ نگاروں کے علاوہ اور بھی بہت سے فنکار ہیں جنہوں نے اس صنف میں کافی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔

مذکورہ قلم کاروں نے انشائے کے علاوہ افسانوی ادب میں بھی کمال حاصل کیا ہے۔ اور ساتھ میں انشائیہ کی صنف کو بھی دلچسپی سے خالی نہیں رہنے دیا۔اس دور میں اور اس سے پہلے بھی انشائیہ نگاری کا بڑا سبب اخبار ہیں۔ریاست میں بہتات کے ساتھ اخبار جاری ہونے لگے اس کے مدنظر کوئی حیرت کی بات نہیں کہ یہاں ان گنت انشائیہ نگار پیدا ہوئے۔ ریاست میں اخباروں کے اجراء کی اجازت سے قبل کشمیر کے اہل قلم نے ہندوستان کے دوسرے شہروں مثلاً لاہور، امرتسر، سیالکوٹ سے اخبار جاری کیا یہ قلم کار انشائیوں کے علاوہ کالم اور اخباروں میں مضمون بھی

لکھتے تھے۔ان کے انشائیے اور مضمون موضوعات کے لحاظ سے کافی وسعت رکھتے تھے۔ ریاست جمّوں وکشمیر کے قلم کاروں میں انشائیہ لکھنے کا ذوق سیماب کی دین ہے۔ وہ ریاست میں سیر وتفریح کے لئے آئے تھے اور یہاں طویل قیام کے دوران نوجوانوں قلم کاروں کے اندر خوابیدہ ذوق اُجاگر کیا۔

عزیز کاشمیری جو ''روشنی'' ہفتہ وار سرینگر مرتب کرتے تھے۔انہوں نے اپنے مضمون ''صحافت'' میں ریاست جمّوں وکشمیر کی تفصیل کو جمع کیا ہے۔ غلام رسول کوچک، صدر الدین مجاہد اور ملک زادہ غلام نبی مشہور سیاسی کارکن تھے۔ وقتاً فوقتاً ان میں سے ایک کا تعلق سیاست سے تھا۔کوچک اننت ناگ کے متوطن ہیں ۔ اور شیخ محمد عبد اللہ اور مرزا احمد افضل کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ مجاہد کا تعلق بھی یہی سے تھا۔انہوں نے ایک مضمون ''حجاز'' کے عنوان سے لکھا جو محمد اکبر خان کو خراج عقیدت کے طور پر لکھا۔

ملک زادہ کا تعلق بھی اسی دور سے تھا۔انہوں نے کشمیری میں اون کی صنعت کے نام سے ایک انشائیہ لکھا۔ جو اس صنعت کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔

جگن ناتھ خیبری، نشتر کاشمیری سرینگر کے متوطن تھے۔ ریاست کے ایک اسکول میں مدرس تھے۔ وہ ریاست کے پرانے قلم کاروں میں سے ہیں۔ وہ عموماً مزاحیہ انداز کے انشائیے لکھتے تھے۔انہوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے تھے۔ صحافت میں بھی وہ

دلچسپی رکھتے تھے۔ جمّوں کے ''چاند'' کے اداریئے میں وہ لکھتے تھے۔ نشتر کا ایک مضمون ''کھانا'' کے عنوان سے چھپا تھا۔ اس سادہ عنوان سے انہوں نے سماجی اور سیاسی مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ نشتر کا ایک انشائیہ جو ''خیالی پلاؤ'' کے عنوان سے ہے۔ یہ 1949ء میں سری نگر سے شائع ہوا اس انشائیے میں ان کا ایک خاص انداز نمایاں ہے۔ اور فراق کو بھی بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ اس انشائیے کا آغاز اس طرح کرتے ہیں۔

''ہندوستان کے مفکر اعظم حضرت شیخ چلی علیہ الرحمہ کو خُدا
جنت بخشے جن کی برکت سے اب ہم بھی خیالی پلاؤ کا لطف
اٹھاتے ہیں۔ اور جب جی چاہتا ہے تو ہم شکم سیر ہو کر
خیالی پلاؤ پکائے ہیں۔ جب انسان کو پلاؤ نہ ملے تو وہ
خیالی پلاؤں کھانے لگتا ہے۔'' [1]

ہنس راج پنڈوترا بھی عموماً تاریخی موضوعات پر لکھتے تھے۔ ان کا ایک آخری مضمون ''علاقہ ڈگر کے قدیم باشندے'' کے عنوان سے 1969 میں شیرازہ میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے جموں کے ڈگر علاقوں کا جائزہ لیا ہے۔

وشوناتھ کھجوریہ، رام ناتھ شاستری اور نریندر کھجوریہ تینوں بھائی ہیں۔ علم وادب کا کافی ذوق رکھتے تھے۔ وشوناتھ ڈوگری کے اچھے انشائیہ پرداز تھے۔ ڈوگری ادب

مصنّفین کو روشناس کروانے کے لئے وہ اُردو میں بھی لکھتے تھے۔ وشوناتھ کے دوسرے بھائی پروفیسر رام ناتھ شاستری، مولانا ابوالکلام آزاد میموریل کالج میں سنسکرت کے پروفیسر تھے۔ ان کا شمار بھی ڈوگری کے ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ اردو سے انہیں بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اور وہ ''شیرازہ'' کے اُردو سیکشن کی مجلس مشاوات کے رُکن رہے۔ انہوں نے کئی علمی اور معلومات مضامین لکھے۔ ان کے چھوٹے بھائی نریندر کھجوریہ بھی علم وادب سے کافی محبت رکھتے تھے انہوں نے مزاحیہ انداز کے انشاییۓ تحریر کر کے اس صنف میں اہم رول ادا کیا۔

سورج صراف لالہ ملک راج صراف کے فرزند تھے۔ اُن کی ذہنی تربیت، صحافت اور ادب کے ماحول میں ہوئی۔ اس میں کوئی تعجب نہیں کہ وہ انشائیہ پردازی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ سورج صراف بھی مضامین لکھتے ہیں۔ ان کا ایک مضمون بھدرواہ کے بارے میں ''ہمالیہ کی ایک حسن وادی''، تعمیر میں 1961 میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے ایک مشہور تہوار ''یورپی سیاح دین'' کے تاثرات کو نقل کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کوہ ہمالیہ کے دامن میں کشمیر کے بعد یہ سب سے زیادہ خوبصورت جگہ ہے۔ نور محمد بٹ کشمیری ادب کے دلدادہ میں سے ایک ہیں۔ وہ ایسے موضوعات پر مضمون لکھتے ہیں۔ شمسار صندکول کا تذکرہ انگریزی کے مصنّف کی حیثیت سے گزر چکا تھا۔ اور ان کی تصنیف اچھی خاصی ہے۔ کول سرینگر کے متن اسکول کے مدرس رہے

ہیں۔سبکدوش ہوکرعلمی مشاغل میں لگے ہوئے تھے، اُردو میں وہ اپنی دلچسپی کے موضوعات کشمیر کی تاریخ کے مقامات اور خاص طور پر پرندوں کے بارے میں لکھتے تھے۔ان کا ایک قابل مطالعہ مضمون ''کشمیر کا عالمِ ظہور'' 1962ء میں شیرازہ میں شائع ہوا۔

بنسی لال رینہ بانڈی پور کے متوطن تھے۔انہیں خاص کر بچوں کی دلچسپی کے مضامین اور لطیفے لکھنے کا بھی شوق تھا جو کافی مذاحیہ انداز کے ہیں ان کی تخلیقات میں بھی انشائیہ کا عنصر نظر آتا ہے۔بلدیو پرشاد شرما ریاست کے مشہور صحافی ہیں۔ وہ کافی عرصہ تک کشمیر ٹائمز کی ادارت کرتے رہے ان کی صحافتی صلاحیت کے مدِ نظر حکومت نے انہیں انفارمیشن کے محکمہ میں مددگار ناظم کے عہد پر مامور کر دیا اس کے علاوہ بنسی لال اس کے علاوہ اردو کے مضمون لکھتے تھے۔ان کے ساتھ لکھنے والوں میں ڈاکٹر شری رام پنڈت، جانکی ناتھ گنہار، دیو کرن سنگھ، دھرم چند سانت اور پروفیسر بلجی ناتھ پنڈت کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

پروفیسر محمد ابراہیم جو عربی اور فارسی کے عالم تھے۔اس کے علاوہ وہ اُردو پر بھی دسترس رکھتے تھے۔انہوں نے مذکورہ تینوں زبانوں میں ایم۔اے کیا ہے۔وہ سرسری طور پر کالجوں میں درس بھی دیتے تھے۔ان کی قابلیت کو دیکھ کر حکومتِ جمّوں وکشمیر نے انہیں ریسرچ اینڈ پبلیکیشن کمیشن کے محکمہ میں مددگار کی حیثیت سے متعین

کیا۔ پروفیسر ابراہیم اُردو میں علمی اور تحقیقی جیسے موضوعات پر لکھتے تھے۔ سری پرتاپ کالج میں کام کرنے کے زمانے میں طلباء کو ادبی اور تحریری صلاحیتوں کو اُبھارنے میں انہوں نے بڑا نمایاں کردار نبھایا ہے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثر کے عہد میں کالج کے اُردو و ادبی کاموں کو بڑے ذوق وشوق کے ساتھ سرانجام دیا جاتا تھا۔ ان کے انشائیوں میں کشمیر کے علماء مرزا مہدی مجرم، ذکر سعادت وغیرہ شامل ہیں۔

مشتاق سیاسی مسائل کے بارے میں اپنی رائے رکھنے کے علاوہ ادبی مذاق سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ ''تنہائی'' کے عنوان سے ان کا ایک انشائیہ ہے جس کا اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔

''میں سوچتا ہوں اور سوچنے میں حق بجانب ہوں کہ تنہائی ایک بڑی نعمت ہے تصورات کی دنیا میں کھو کر لطف اندوز ہوتا ہوں میں اپنے کو اکیلا اور بے بس نہیں پاتا۔ جن سے ملنے کی کبھی امید نہ تھی وہ بالکل میرے قریب بیٹھے ہیں اور بے تکلفی کے ساتھ معصومانہ انداز میں میرے ہر سوال کا حوصلہ افزا جواب دے رہے ہیں۔'' ۲

پروفیسر ارجن ناتھ رینہ جغرافیہ کے اُستاد ہیں انہوں نے مختلف کالجوں میں کام کیا اور علم و ادب کا بھی وہ ذوق رکھتے ہیں۔ کالج کی ملازمت کے دوران وہ کالج

کے رسالے ''پرتاپ'' میں لکھا کرتے تھے ان کا انشائیہ ''غُلامی'' ہے۔انہوں نے اس انشائیہ میں غلامی کے متعلق کھل کر بات کی ہے۔''ماہ''ایک رسالہ کشمیر سے نکلتا تھا۔اس میں بھی وہ کافی عرصہ تک لکھتے رہے۔

غلام محمد میر راجپوری ریاست میں کئی سطحوں پر کام کرتے تھے۔وہ وزیر بھی رہے اور قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ترقی پسند تحریک سے وہ کافی متاثر ہیں اور ریاست کی سیاست میں بھی وہ نمایاں مقام رکھتے تھے۔وہ وزیر صحت اور سیاحت بھی رہے ہیں۔اس مناسبت سے وہ بیماریوں سے بچنے کے لئے مضمون لکھتے تھے۔سیاحت کے نئے امکانات پر انہوں نے ایک انشائیہ نما مضمون لکھا، جس میں نوجوان کی مہم پسندی کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی۔

غیر افسانوی ادب میں دوسرا اہم نام سفرنامے کا ہے۔اگرچہ ریاست جموں وکشمیر میں سفرنامے کی روایت دیر سے شروع ہوئی ہے۔مگر اس بات کا اعتراف ضرور کرنا ہوگا کہ مغربی ممالک نے جس سفرنامے سے استفادہ کیا ویسا ہم نہیں کر سکے۔ ہمارے یہاں ہندوستان میں بہت سے سفرنامے لکھے گئے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری قوم کی قدیم تاریخ کا ایک اہم اور ضروری سرچشمہ سفرنامے ہی رہے ہیں ابتدائی دور میں عربی مُصنفوں کی اہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو صاف معلوم ہوگا کہ ان میں سفرنامے کے خدوخال بہت اچھی طرح اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ان میں

مثال کے طور پر ابنِ الندیم''ابنِ بطوطہ''بیہقی اور ابن خلدون جیسی ہستیاں شامل ہیں جن کو تاریخ اسلام اور تاریخ اقوام کے عظیم سالح بنایا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عربوں تاریخ اصولی طور پر ان کے سفر مانے ہیں۔

سترہویں صدی میں یورپی سیاحوں کو دنیا بھر کے ملکوں میں سیاحت کرتے دیکھا گیا جو ایشیا، چین، جاپان، منگولیا سے ہو کر افریقہ تک کے ملکوں کا احاطہ کرتے تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں ہم تفصیل میں نہ جاتے ہوئے ریاست جموں وکشمیر کا ذکر کریں گے۔ تو معلوم ہوگا کہ انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر جب انگریزی حکومت کا ہندوستان پر قبضہ ہوا تو کئی یورپی سیاح کشمیر کے دور دراز علاقوں میں گھومتے پھرتے رہے۔ انہوں نے تفصیلی سفر نامے لکھ کر کشمیر کی تاریخ وتمدن اور معاشیات کے بارے میں ذی قیمت اطلاعات باقی چھوڑ دی ہیں۔ سفر نامے میں ذاتی نگارشات اور ڈائریاں بھی شامل ہیں۔ جو درحقیقت چھپانے کی غرض سے نہیں لکھی گئی تھیں۔ لیکن ان کی تاریخی اور ثقافتی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس ضمن میں''مور کرافٹ کی ڈائری'' قابلِ ذکر ہے۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دورِ حکومت میں ایک نیم سرکاری وزیر مرکزی ایشیا یعنی ترکستان کے سفر پر روانہ ہوا۔ اس وفد کی قیادت کشتواڑ کے سرکردہ خاندان کا ایک مقتدر فرد مہتا شیر سنگھ کر رہا تھا۔ جو کشمیر سے چل کر برائے راست سمرقند اور بخارہ پہنچا

اور پھر واپسی پر سمرقند ختن کے راستے سے ہوتا ہوا تبت اور لدّاخ میں چلا گیا۔ اور واپس آ کر کشمیر پہنچا اس سارے سفر میں ایک سال سے زیادہ وقت لگا۔ واپس آ کر وفد نے اپنا سفر نامہ فارسی میں تحریر کیا۔ اس زمانے میں ایک سفر نامہ عزت اللہ نے تحریر کیا۔ جس کو ''سفر نامہ عزت اللہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو ادب کی قریب قریب تمام اصناف میں نہایت ہی عمدہ نمونے ملتے ہیں جیسے ناول، افسانہ، ڈرامہ، انشائیہ، خودنوشت، سوانح عمری اور سفر نامے وغیرہ ان تمام اصناف نے ریاست میں ترقی کی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ اُردو سفر مانے کی روایت کو آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ ریاست جموں وکشمیر میں اردو سفر نامے کے ابتدائی نقوش ہمیں پنڈت سالگ رام سالک کے سفر نامے ''تحفۂ سالک'' میں ملتے ہیں۔ بقول برج پریمی:۔

> ''تحفۂ سالک ان کا سفر نامہ ہے جس میں دوسرے ممالک کی تاریخ اور جغرافیہ کا سہارا لے کر وہاں کی ترقی کا حال لکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں قصّے کی تکنیک کا التزام کیا گیا ہے۔'' ۳

ابھی تک ریاست جمّوں وکشمیر میں جو سفر نامے لکھے گئے۔ ان کے نام اس طرح ہیں۔

۱۔ ''میری پاکستان یاترا''۔ ملک راج صراف

۲۔ ''پاکستان میں دو دن'' اوم پرکاش صراف

۳۔ ''پشکن کے دیس میں'' جگن ناتھ آزاد

۴۔ ''کولمبس کے دیس میں'' جگن ناتھ آزاد

۵۔ ''روس کا سفر'' صوفی غلام محمد

۶۔ ''پاکستان کا سفر'' خواجہ ثناء اللہ بٹ

۷۔ ''پاکستان کا سفر'' حامدی کاشمیری

۸۔ ''پاکستان کا سفر'' وجیہہ احمد اندرابی

مذکورہ سفرناموں میں چار سفرنامے کتابی صورت میں منظرِ عام پر آ چکے ہیں باقی ریاست کے مختلف اخباروں میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے انگریزی میں ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا نے My Tavik Friends کے عنوان سے تاجکستان اور ازبکستان کا سفر نامہ تحریر کیا۔ 1997ء میں کشمیر کے ایک ادیب اور تاریخ دان موتی لال ساقی نے قزاکستان کا سفرنامہ لکھا۔ ان دونوں سفرناموں کی کم و بیش تفصیل اس مقالے آ چکی ہے۔

سفرنامہ ''میری پاکستان یاترا'' جموں کے ایک مشہور صحافی اور دانشور ملک راج صراف کا ہے۔ وہ 20 نومبر 1979ء کو پاکستان گئے اور وہاں پر انہوں نے دو ہفتے قیام کیا۔ لاہور سے فیصل آباد اور سیالکوٹ کے دورے کا مقصد اپنے عزیز دوستوں

اور رفقیوں سے ملنا تھا اس مقصد کے تحت انہوں نے یہ سفر کیا وہ اس میں پوری طرح کامیاب بھی رہے ہیں۔

''میں محض اپنی انفرادی حقیقت میں ہندوستانی ہونے کے
ناطے اپنے ہمسایہ ملک پاکستان میں انسان کو دیکھنے گیا تھا۔
اور مجھے اطمینان اور خوشی ہے کہ میرا تجربہ ناکام نہیں رہا۔'' ؎۴

اس کے بعد دوسرا سفرنامہ ''پاکستان میں دودن'' اُوم پرکاش صراف کا ہے۔ یہ سفرنامہ سیاسی نوعیت کا ہے۔ تقسیم وطن کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جمّوں وکشمیر کا مسئلہ متنازعہ کا باعث بنا۔ بقول اوم پرکاش صراف:۔

''مہاراجہ ہری سنگھ جمّوں وکشمیر کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔
مگر بڑے پڑوسیوں کے خوشنودی کے بغیر آزادی
خواب زیادہ اور حقیقت کم معلوم ہوئی۔'' ؎۵

چنانچہ ریاست جمّوں وکشمیر دوحصّوں میں تقسیم ہوگیا ریاست کی بھاگ ڈور شیخ محمد عبداللہ نے سنبھالی۔ لیکن کئی وجوہات کی بنا پر انہیں ۱۹۵۳ء میں نظر بند کردیا گیا۔ پھر ۱۹۶۴ء میں علامہ محمد صازف کے دور حکومت میں انہیں رہا کیا گیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے انہیں بات چیت کے لئے بلایا۔ اور کہا کہ دونوں ملکوں کی عوام کو ذہنی طور پر نزدیک لائیں۔ چناں چہ اس سلسلے میں شیخ صاحب نے پاکستان

کا دورہ کیا تا کہ کشیدگی کو ختم کیا جا سکے۔ اوم پرکاش صراف بطور صحافی ان کے ہمراہ ہو گئے ۔ انہوں نے اپنے سفر کی روداد کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے ۔ یہ سفر نامہ سیاسی نوعیت کا ہونے کے باوجود دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اس سفر نامے کو پڑھ کر ملک کی تقسیم کا المیہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے ۔ کیوں کہ وہاں ان کو کئی مہاجروں سے ملنے کا موقع نصیب ہوا۔ جو بے شک وہاں کی زندگی کے بیشتر کاموں میں مصروف رہیں۔ لیکن ان کی روح اپنے وطن ہندوستان میں رہ گئی ہے۔ انہوں نے ان چند جذباتوں کو ابھارا ہے۔ وہ سفر نامے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"راولپنڈی میں اُردو روزناموں کے صوری اور معنوی
خوبیوں نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا۔ دلی کے
اُردو اخبارات بلکہ وسیع تر حلقہ اشاعت رکھنے
والے ہندی روزنامے بھی پاکستان کے اُردو
پریس سے کہیں چھپتے ہیں۔"٦

سفر نامے میں تیسرا اور سب سے اہم نام پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا ہے۔ انہوں نے جمّوں میں بیٹھ کر جو کام کیا ہے ۔ اس سے ہمارے بیش بہا ادبی خزانے میں اضافہ ہوا ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد اکثر و بیشتر بین الاقوامی سیمناروں میں شرکت

کرتے تھے۔توسیعی خطبات دیتے اور دوسرے مشاعروں میں شرکت کرنے کے لئے کسی نہ کسی ملک کا سفر کرنا پڑتا تھا۔انہیں مختلف مما لک کی سیر وسیاحت سے جو تجربات اور مشاہدات حاصل ہوئے۔انہوں نے ان تمام واقعات کوسفر نامے کی شکل میں قلمبند کردیا۔سفر نامے جہاں ہمارے ادبی خزانے میں اضافہ کرتے ہیں۔وہاں یہ آنے والی نسلوں کے لئے معلومات کا خزانہ اور بصیرت کی شمع بھی روشن کرتے ہیں۔ یہ تینوں سفر نامے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں پہلا ''جنوبی ہند میں دو ہفتے'' دوسرا ''پکشن کے دیش میں'' اور تیسرا ''کولمبس کے دیش میں''۔

''پشکن کے دیش میں'' آزاد صاحب کا وہ سفر نامہ ہے جس میں انہوں نے روس کے سفر کی روداد لکھی۔یہ سفر نامہ انہوں نے 3رجنوری 1978ء میں لکھا۔یہ اکیس دن کا سفر تھا۔اس میں انہوں نے روس کے اندر جو دیکھا ویسا ہی اپنے انداز میں پیش کیا۔ وہ اس سفر نامے میں لکھے ہیں۔

> ''علم وفن کی قدر و قیمت کا ایک بہت اونچا معیار مجھے اس ملک میں دیکھنے کو ملا۔بازاروں اور خریداروں کے لمبے لمبے کیو یہاں آلو۔پیاز ارمٹی کے تیل کی دکانوں پر نظر نہ آئے۔بلکہ کتابوں کی دکانوں میں نظر آئے۔یہاں وہ بھوک اور پیاس نہیں جو ہر مشرق ملکوں کا مقدر بن

چکی ہے۔ بلکہ علم کی تشنگی ہے کتابوں کی پیاس ہے اور
کتابوں میں لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہی فوراً اپنے
عشاق کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہے۔'' ۷

یہ سفر نامہ اپنی ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ بے شک روس آج دنیا کے ایک طاقت ور ملک کے طور پر نہیں رہا لیکن پشکن کے دیس میں وہ ایک عظیم ملک کے طور پر ہمیشہ قائم رہے گا۔

''کولمبس کے دیس میں'' جگن ناتھ آزاد کا دوسرا اہم سفر نامہ ہے۔ آپ ۱۶/اگست ۱۹۸۱ء کو ایس ویسٹ شکاگو یونیورسٹی کے چانسلر وصی اللہ خان کے دعوت نامے پر ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے امریکہ گئے۔ آپ کے اس سفر نامے میں ان کی خاص توجہ کا مرکز وہاں کی یونیورسٹیاں رہیں۔ روس کے سفر کی طرح اس سفر میں بھی انہوں نے امریکہ میں علمی وادبی سرگرمیوں کا جائزہ بھرپور انداز میں لیا ہے۔ وہاں کے مختلف شہروں میں ان کی ملاقاتیں بڑے بڑے شعراء، دانشوروں اور عالموں سے ہوئی۔ یہ سفر نامہ ادبی اہمیت کا حامل ہے انہوں نے سیاسی، سماجی اور تاریخی موضوعات پر لکھنے کے بجائے زیادہ تر علمی وادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے زیادہ تر سفر جموں سے ہی کیے ہیں۔

1982ء میں کشمیر یونیورسٹی میں سینٹرل ایسوسیشن اینڈ سڈیڈیز کے ساتھ

ڈائریکٹر ڈاکٹر کاشی ناتھ ہنڈ ٹا نے مرکزی ایشیا کا سفر کیا جو انگریزی زبان میں لکھا بعد میں MyTajik Friends کے عنوان سے چھپا۔ وہ تاجک اکادمی کی دعوت پر گئے اور ایک مہینہ کا بیشتر حصہ تاجکستان میں ہی گزارا۔

یہ سفر نامہ 120 صفحات پر مشتمل ہے۔اس سفر نامے میں درحقیقت وسط ایشیا کی عکاسی کی گئی ہے۔ جو معاشرے سے متعلق ہے۔ اگر چہ موصوف سفر نامے وسط ایشیا کا دورہ کر چکا ہے۔جس وقت سویت یونین کی عملداری اپنے عروج پر تھی سیاسی نظریات اور رُجحانات سے بالاثر ہو کر یہ سفر نامہ وسط ایشیا کے لوگوں کے معاشرے ان کی زندگی اور ان کی ثقافتی ورثے پر بڑی گہری اور سودمند نظر ڈالتا ہے۔ سفر نامے کا مطالعہ ہمیں وسط ایشیا کے تمدن ،تاریخ اور ادبی سماج اور آرٹ گویا زندگی کے ہر شعبے میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔

ان سفر ناموں کا جائزہ لینے کے بعد اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست میں یہ صنف اپنی کم سنی کے باوجود ہیئتی موضوعاتی اور تکنیکی سطح پر اعلیٰ روایات قائم کر چکی ہے اور ہر سفر نامہ ملکی اور بین الاقوامی سفر نامے کے صفِ اوّل میں رکھے جا سکتے ہیں۔

غیر افسانوی ادب میں تیسرا حصّہ سوانح حیات پر مشتمل ہے۔سوانح حیات اُردو میں ایک اہم اور مشکل ترین صنف ادب ہے۔ مذکورہ صنف ادب کو تحریریت کا جامع پہناتے وقت اس بات کا دھیان ہونا چاہئے کہ زندگی کا کوئی پوشیدہ پہلو باقی نہ

رہے۔یعنی سوانح نگار کی سرگذشت لکھی جارہی ہے۔سوانح نگار کو اس کے تمام زندگی کے حالات و واقعات اور جذبات کو اس طرح پیش کیا جانے چاہئے کہ اس میں حقیقت نگاری کا عنصر بھی ہو اور انداز بیان بھی سادہ ہو۔ جہاں تک سوانح نگاری کی تاریخ کا تعلق ہے تو ایمرسن کا خیال ہے کہ جب کوئی عظیم انسان عظیم تر انسان کی زندگی کی تشریح کرتا ہے تو سوانح عمری وجود میں آتی ہے۔لیکن اس کے برعکس ''لاف آف اسٹرنگ'' کے مصنف نے اپنی تصنیف میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ کسی عام انسان کی زندگی کے سفر کی روداد بھی ایسی دلکشی کے ساتھ پیش کی جاسکتی ہے کہ وہ بڑے بڑے آدمیوں کی توجہ کا مرکز بن سکے۔زیادہ تر لوگ ان بڑے لوگوں کے زندگی کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں جنہوں نے کوئی نا قابل فراموش کام سرانجام دیا ہو۔سوانح حیات سے اُردو میں ہمیں عظیم دانشوروں ،شاعروں ، سیاست دانوں ، سائنس دانوں ، مذہبی رہنماؤں ،سماجی کارکنوں وغیرہ کی پوری شخصیت کو جاننے کا موقعہ ملتا ہے۔ان شخصیات کی سوانح حیات کو پڑھ کر ہم جیسے لوگوں کو بھی زندگی میں کچھ کر گزرجانے کی چاہت پیدا ہوتی ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کا کہنا ہے کہ عظیم انسانوں کے پرعظمت کارنامے پڑھ کر ہمارے دلوں میں بھی ان جیسا بننے کی خواہش پیدا ہوئی۔

جمّوں وکشمیر میں سوانح حیات کی حقدار کافی زیادہ ہیں۔ اب تک ریاست

میں جتنے بھی سیاست دان، ادیب، عظیم ہستیاں گزر چکی ہیں۔ ان کی سوانح حیات موجود ہیں۔ جیسے شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی ''آتشِ چنار''، سورش کاشمیری کی ''بوئے گُل''، نالہ دل، دو چراغ بیگم ظفر علی کی ''میرے شب و روز''، محمد دین فوق کی ''سرگذشت فوق''، چوہدری غلام عباس کی ''کشمکش'' صابر آفاقی کی ''نایاب ہیں ہم'' ثریا خورشید کی ''چناروں کے سائے، قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' ڈاکٹر کرن سنگھ کی ''سفرِ زندگی'' ڈی ڈی ٹھاکر کی ''یادوں کے چراغ'' سید آغا زاشرف کی ''کچھ تو لکھئے کہ لوگ کہتے ہیں۔'' سید علی شاہ گیلانی کی ''ڈلر کنارے'' پروفیسر شہاب عنایت ملک کی ''یادوں کے لمس'' اور پروفیسر حامدی کاشمیری کی ''رہگزر در رہگزر'' وغیرہ سوانح حیات قابل ذکر ہیں۔

''آتش چنار'' 921 صفحات پر لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب ۷۳ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ آتش چنار شیخ محمد عباللہ کی سوانح حیات ہے جو کہ سابقہ وزیر اعظم تھے۔ ''آتش چنار'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۶ء میں عصی محمد اینڈ سنز سرینگر اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں گلشن بک سرینگر سے منظر عام پر آیا۔ اس کتاب کے شروعات میں ''پیش گفتار'' کے عنوان سے بیگم اکبر جہاں، شیخ محمد عبداللہؒ نے اس کتاب کا تعارف کروایا۔ جب کہ پیش لفظ اور کتاب کی ترتیب ریاست جموں وکشمیر کے نامور نقاد و محقق محمد یوسف ٹینگ نے دی۔ شیخ محمد عبداللہ اپنی سوانح حیات ''آتش چنار'' لکھنے کی طرف کیوں مائل

ہوئے۔اس ضمن میں محمد یوسف ٹینگ سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مجھے لگتا ہے کہ جس آدمی کی مجھے تلاش تھی وہ تم ہی ہو۔
تم نے اچھی کوشش کی ہے۔اب اس سلسلے کو آگے
بڑھانا ہوگا لیکن بات یاد رکھنا کہ میں بہت سے
مضمون میں مشغول رہتا ہوں تم پیچھا کرو گے تبھی
یہ کام پورا ہو سکے گا۔'' ۸؎

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات صاف طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ کتنی محنت و لگن کے ساتھ محمد یوسف ٹینگ نے شیخ عبداللہ کی پوری زندگی کے واقعات کو قلمبند کیا ہے۔آتش چنار میں شیخ عبداللہ نے فلیش بیک ٹکنیک کا استعمال کیا ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی رہی کہ انہیں اپنی زندگی کو پوری طرح سے سوچنے اور ترتیب دینے کا موقع نہیں ملا۔کیونکہ شیخ محمد عبداللہ کی زندگی میں کئی اتار چڑھاؤ آئے۔اس بات کا اندازہ ہمیشہ ان کی پہلی بات کے عنوان سے ہوتا ہے:۔

''بھئی میری زندگی اتنے طوفانوں اور بحرانوں سے
گزری ہے۔ساری چیزیں کہاں یاد رہیں گی اور
پھر بات میں بات نکلتی ہے۔اب اس عمر میں تو
حافظہ بھی ساتھ چھوڑنے لگا ہے۔'' ۹؎

''آتش چنار'' میں شیخ محمد عبداللہ نے اپنے بچپن، ابتدائی تعلیم، گھریلو مسائل سے لے کر اپنی زندگی کے آخری دن تک کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا۔ ہمیں ان کے عہد کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس میں ہمیں ایک اہم معلومات کا پتہ چلتا ہے۔ اور خاص کر کے ریاست جموں و کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق کے بارے میں پوری معلومات فراہم ہوتی ہے۔ اس کتاب میں شخصی دور کے مہاراجوں کا ذکر ہے۔ اپنی زندگی کے قید و بند کا بھی ذکر کیا ہے۔ مصنف نے جو بھی اس کتاب میں پیش کیا ہے کہیں پر بھی حقیقت کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ مصنف سوانح حیات کے فن سے کافی واقف ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں پنڈت جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی، سردار پٹیل، سروجنی نائیڈو، محمد علی جناح کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور کئی حادثات اور واقعات کے ساتھ ساتھ دفعہ 370 کا بھی ذکر کیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب ریاست جموں و کشمیر میں سوانح حیات کے آغاز وارتقاء میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس سے نہ صرف ہمیں مصنف کی زندگی کے بارے میں معلومات ملتی ہے بل کہ ان کے پورے عہد کی عکاسی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ ہمیشہ ہندو مسلم بھائی چارے کے قائل تھے۔ ان کی تمام محنتوں اور کاوشوں کا نتیجہ اس کتاب میں ملتا ہے۔

''آتش چنار'' کے بعد خودنوشت کے سلسلے کی اگلی کڑی سورش کاشمیری کی ''بوئے گل

نالہ دل دو چراغ محفل'' ہے۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے۔ کہ اس کتاب کے موضوع کا عنوان مرزا غالب کے شعر سے اخذ کیا گیا ہے۔ 334 صحافت پر مشتمل یہ کتاب 1974ء میں منظر عام پر آئی۔ اس سوانح حیات کو 43 ابواب پر مشتمل کیا ہے۔ اس سوانح عمری میں مصنف نے جہاں اپنے حالات، خاندانی پس منظر اور سکول کی یادوں کو تازہ کیا۔ تو وہیں دوسری طرف اپنے ہم جماعت دوستوں اور اساتذہ کا تذکرہ بھی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ سورش کاشمیری نے اپنے دور کے تعلیمی اداروں کی جو تفصیل درج کی ہیں۔ اس سے اس بات کا پوری طرح سے اندازہ ہوتا ہے کہ کاشمیری صاحب اپنی زندگی میں نظم وضبط کے کافی پابند رہے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مصنف جن اہم شخصیات سے وہ متاثر تھے ان میں چوہدری افضل حق، مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خان وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ کاشمیری نے اپنی زندگی کے جو واقعات وتجربات پیش کئے ہیں وہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ سوانح نگار اپنی آپ بیتی، بوئے گل نالہ دل دو چراغ محفل'' کے علاوہ اور بھی کتابیں لکھی ہیں جن میں ''پسِ دیوارِ زنداں''، ''خدمت سے واپسی'' اور ''تمغہ خدمت'' وغیرہ کتابیں سرفہرست ہیں۔

مجموعی طور پر بوئے گل نالہ دل دو چراغ محفل'' کا شمار اردو سوانح حیات میں ہوتا ہے اور یہ کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اس سوانح عمری میں تمام خوبیاں موجود ہیں۔ جو

ایک سوانح حیات میں ہونی چاہئے۔اس سوانح حیات کے بعد جمّوں وکشمیر میں خود نوشت کی اگلی کڑی بیگم ظفر علی کی کتاب ''میرے شب وروز'' ہے جو۱۲ر مارچ 1980ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔مصنفہ نے اس کتاب کی شروعات عصمت چغتائی کے ایک خط سے کی ہے۔جس میں مصنفہ نے اپنی بیٹی کی جلاوطنی پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔سوانح نگار نے''میرے شب وروز''میں اپنے آباواجداد کے آنے کی تفصیل بھی درج کی ہے۔مصنفہ نے اس سوانح حیات میں سماج کی غیرضروری رسم ورواج کو بے نقاب کرتے ہوئے ان پر طنز کیا ہے۔اس کتاب کے مطالعہ سے ہمیں عورتوں کی سماجی،تعلیمی،اقتصادی،فلاح وبہبودی کے بارے میں پتہ چلتا ہے اورعورتیں کس طرح سے قربانی دیتی ہیں سب کچھ اس کتاب کو پڑھنے سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔اور پسماندہ علاقوں کی عورتیں کسی طرح اپنے مسائل سے دوچار ہوتی ہیں عورتوں سے مخاطب ہوکر تقریریں بھی کیں۔ایک جگہ لکھتی ہیں:۔

> ''اگر کسی قوم کو متحد قوم بننا ہو تو عورتوں کو نظرانداز نہیں
> کیا جاسکتا ہے۔کیونکہ جب تک عورت سماج میں نہ
> ہاتھ بٹائے تو قوم لنگڑی ہی رہے گی۔بلکہ ہماری
> آئندہ نسل بھی جاہل کی گود میں پل کر روشن مستقبل
> کی ضامن نہیں ہوسکتی۔''

بیگم ظفر علی نے جموں وکشمیر کی عورتوں کے مسائل کے لئے کافی جدو جہد کی ان کی جدو جہد سے شیخ محمد عبداللہ نے ریاست جموں وکشمیر میں عورتوں کے لئے سرکاری وغیر سرکاری اسکول کھلوانے کا اہتمام کیا۔ اس کے علاوہ بیگم ظفر علی نے Ladies Club کی داغ بیل ڈالی۔ جس سے عورتوں کے لئے ترقی کے راستے ہموار ہوئے۔ اور اگر کسی عورت کو کسی طرح کی کوئی پریشانی ہو تو سب عورتیں مل کر اس کا حل نکالیں اس کتاب میں محمد علی جناح کے اس کشمیر دورے کا بھی بڑے بے باکی سے ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں جناح سیر وسیاحت کی غرض سے کشمیر آئے تھے اور محمد علی جناح جب کشمیر آئے تو بیگم نے نہ صرف جلسے کا اہتمام کیا بل کہ پاکستان زندہ باد کے نعرے بھی لگائے تھے۔ جس کی عوض میں مصنفہ کو آل انڈیاWoman کانفرنس کی حیثیت سے استعفیٰ دینا پڑا۔ سوانح نگار نے ''میرے شب و روز'' میں کشمیر میں ان قبائیلوں اور جمّوں میں R.S.S کا بھی ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہزاروں بے گناہوں کو جاں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مصنفہ ایک جگہ خود اس واقعے کا ذکر اس طرح کرتی ہیں:۔

''وہ لوگ ایک طوفان کی طرح فتح کرتے ہوئے
لوگوں کو مارتے ہوئے بارہمولہ پہنچ گئے تھے
دونوں صوبوں میں ایک جیسی کہانی دہرائی جا
رہی تھی اگر قبائیلی سکھوں کو مارتے ہوتے

آئے تو جموں میں مسلمانوں کو آر ایس ایس
نے تیغ کیا۔ سوائے چند گھرانوں کے جو
استاد محلے میں کرنل پیر محمد کی ہمسائیگی میں
اپنی جان بچاسکے۔'' [۱۰]

اس کتاب کے مطالعے سے ہمیں نہ صرف ڈوگرہ راج اور شیخ محمد عبداللہ کے کارناموں کا علم ہوتا ہے بلکہ تقسیم ہند کا بھی علم ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد پورا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے پورا گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کتاب میں مصنفہ کے اپنی ذاتی زندگی کے بجائے کشمیری عوام کے مسائل پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ کو ریاست کے عوام کے ساتھ کتنا لگاؤ تھا۔ اس کے علاوہ میرے ''شب وروز'' میں مصنفہ کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے کارناموں سے بھی روشناس ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔ ریاستی سطح پر وہ جن عہدوں پر فائز رہیں مثلاً ڈپٹی ڈائریکٹر، تعلیم نسواں، جموں وکشمیر ممبر قانون ساز اسمبلی، جموں وکشمیر شوشل ویلفیئر ایڈوائزری اور آل انڈیا وومین کانفرنس کی سکریٹری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کتاب میں جن قد آور شخصیات کا ذکر آیا ہے۔ ان میں محمد علی جناح، شیخ محمد عبداللہ، مسٹر کاک، فاطمہ جناح، مسز نہرو وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس کتاب کے آخری حصے میں اسمبلی میں ''میری پہلی تقریر'' کے عنوان سے قانون ساز اسمبلی میں عوامی مسائل کے ساتھ ساتھ سکولوں کی

بدحالی اور صنعتی کارخانوں میں بچوں کے استحصال کے مسئلوں کو پیش کیا ہے۔ بہر حال یہ خودنوشت زبان و بیان کے اعتبار سے دلکش ہے۔ اور جموں و کشمیر میں سوانح نگاری کے ارتقاء میں نہایت اہمیت کی حامل کہی جاسکتی ہے۔

بیگم ظفر علی کی سوانح عمری ''میرے شبِ وروز'' کے بعد ریاست میں جس مصنف نے خودنوشت سوانح لکھی ان میں قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' ہے۔ اٹھارہ ابواب اور 1223 صفحات پر مشتمل اس ضخیم سوانح حیات کا پہلا ایڈیشن لاہور پاکستان سے 1887ء میں اور دوسرا ایڈیشن 2009ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ اب تک کی شائع ہوئی خودنوشتوں کی روایات سے ہٹ کر اس سوانح حیات میں افسانوی انداز اور داستانوی اساطیری کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ شہاب نامہ کو ہم ایک ضخیم ناول بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سوانح عمری کی ابتداء تو مصنف نے ابتدائی تعلیم سے کی ہے۔ لیکن خاندان کے حالات، پیدائش اور اپنی ابتدائی زندگی کو تقریباً نظر انداز کیا ہے۔ ابتدائی ابواب میں شہاب صاحب نے نہ صرف داستانوی، افسانوی انداز اپنایا ہے بل کہ لازوال کردار بھی تخلیق کیے ہیں۔ جس میں صادقہ بیگم اور چندراوتی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس کتاب میں شہاب صاحب نے جو تفصیلات درج کیں ہیں۔ اس میں ان کو I.C.S میں فتح کے ساتھ ساتھ ان تمام عہدوں کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ جن پر وہ فائز رہے اسی دوران مصنف کو نہ صرف تحریکِ

پاکستان کوقریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا بل کہ R.S.S کے سربراہ کا کردار، مسلمانوں کا قتل عام سے خطرناک حادثات وواقعات کے ساتھ کانگریس ہائی کمان کے ترجمان خفیہ منصوبوں کے بارے میں جانکاری حاصل ہوئی ہے۔ ان تمام حالات کا ذکر مصنف نے ''شہاب نامہ'' میں کیا ہے۔ جس سے ہم قدرت اللہ شہاب کے عہد کو بھی پوری طرح سمجھ سکتے ہیں۔ مصنف نے شہاب نامہ میں پاکستان کے ان تین سربراہان جنرل غلام محمد اسکندر مرزا اور ایوب خان کی ذاتی زندگی پر بھی بڑی بے باکی کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔ جس کے ساتھ مصنف کو پرنسپل سکریٹری رہنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ اس کتاب کا ایک بہت بڑا حصہ مافوق الفطری عناصر کے واقعات سے لبریز بھی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس یوں درج ہے۔

''پیتل کا سوئچ کھٹاک سے بجا اور بجلی اپنے آپ بجھ گئی۔
صوفے کے قریب سفید دھوئیں کا ایک چھلا ضرور نظر
آیا جو دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں تحلیل ہو گیا کئی بار ایسا
ہوا کہ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور کمرے
کے اندر جو اینٹیں اور پتھر برس رہے ہیں۔ وہ بالکل
خشک ہیں صبح سویرے اندھیرے میں اس ملبے
کو ٹوکروں کے حساب سے سمٹ کر لان کے تالاب

میں پھینک آیا۔'' [11]

لیکن اس کے باوجود کئی ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جو حقیقت کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ مختصر قدرت اللہ شہاب نے اس آپ بیتی، ذاتی، روحانی، قومی، بین الاقومی، جذباتی، عملی وادبی زندگی کے تجربات واقعات، سیاسی واقعات کو بڑے دلیری سے قلمبند کیا ہے۔ زبان وبیان پر قدرت اللہ شہاب کو دسترس حاصل ہے۔ واقعات کی ترتیب وکرداروں کی تشکیل کے اعتبار سے آپ بیتی کے فن سے مختلف اردو افسانوی ادب کے مماثل قرار دی ہے۔ بہرحال تمام منفی مثبت پہلوؤں کے باوجود یہ کتاب اور سوانح حیات کے ارتقا میں اہمیت کی حامل ہے۔

ریاست میں خودنوشت کی اگلی کڑی میں ڈاکٹر کرن سنگھ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی سوانح عمری ''سفرِ زندگی'' ہے۔ ڈاکٹر کرن سنگھ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ مہاراجہ ہری سنگھ کے صاحب زادے ہیں ان کی یہ خودنوشت سوانح حیات ''سفر زندگی'' 544 صفحات اور 24 ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب 1994ء میں ''گلشن پبلیکیشنز نے شائع کی۔ سوانح نگار نے یہ کتاب انگریزی میں Hear Apparant کے نام سے لکھی ہے۔ مصنف نے اس سوانح حیات میں اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ریاست جموں وکشمیر کی سیاسی زندگی، انتخابات وغیرہ سے بھی بخوبی واقف کروایا ہے۔ 1971ء میں ہندو پاک کی جو لڑائی ہوئی اس کا ذکر بھی

ڈاکٹر کرن سنگھ نے بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ اندرا گاندھی کی Dynamic Leadership کی بھی تعریف کی ہے۔ ڈاکٹر کرن سنگھ اس ضمن میں ہندوستان کے سابقہ وزیراعظم اندرا گاندھی کی لیڈر شپ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ہے:۔

''اندرا گاندھی نے اپنے وزیروں کو دنیا کے مختلف راجدھانیوں میں بھیج کر ان ممالک سے استدعا کی کہ وہ پاکستان کے حکمرانوں کو اپنی ظالمانہ اور نسل کشی کی پالیسی سے باز رکھیں۔ میں ان دِنوں جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک رومانیہ چلا گیا۔ جہاں میں صدر کاوپکو سے ملا اور چیکوسلوواکیہ اور یوگوسلاویہ کے صدر ٹیٹو سے ملا۔ جہاں میں نے ان سے تفصیلی بات چیت کی۔ جب وہ ہندوستان آئے میں ایران کے بادشاہ سے ملا وہ اس بات پر سخت پریشان تھا جس طرح کہ پاکستان کا صدر یحییٰ خان حالات کو بگاڑ رہا تھا۔ جو کہ اس کی طرح شیعہ فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ آخرکار تمام سفارش کو پیش کیا ناکام

ہوگئی۔اور پندرہ روز جنگ جونہایت اچھی طرح
جاری رکھی گئی۔ہندوستان نے جیت لی اور بنگلہ دیش
ایک آزاد ملک کے طور پر وجود میں آیا۔میں اندرا
گاندھی کے بالکل پیچھے بیٹھا تھا۔جب اس نے
مسرت بھری لوگ سبھا میں کہ فوجوں کے ہتھیار
ڈالنے کی خبر کا اعلان کیا۔وہ عام طور پر اپنے
جذبات کا اظہار نہیں کیا کرتی تھی لیکن اس موقع پر
وہ اپنی مسرت اور فتح کے احساس کو چھپا نہ سکی۔'' ۱۲

خودنوشت میں اگلا نام ڈی۔ڈی ٹھاکر کا ہے۔ان کی خودنوشت ''یادوں کے چراغ'' ہے اس کو 2006ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوئی۔اس کا پیش لفظ محمد حسین نائک نے لکھا ہے۔اس کتاب میں ٹھاکر صاحب نے سیاسی وتاریخی واقعات کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ ہم جموں وکشمیر کے سیاسی اور یہاں کے پارٹیوں کے لیڈران کے کارناموں سے بخوبی واقف ہوجاتے ہیں۔اس میں انہوں نے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے جیل جانے کے واقعات کو بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ ٹھاکر صاحب نے اپنی اس خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کے چراغ میں لندن، جرمنی، پیرس، آسٹریلیا، تھائی لینڈ، سوئزرلینڈ، اٹلی، لبنان وغیرہ کا ذکر ہے۔جن میں انہوں نے

دورہ بھی کیا ہے۔انہوں نے اپنے تاثرات بھی قلم بند کیئے ہیں۔

''کچھ تو لکھیں کہ لوگ کہتے ہیں'' آغا اشرف علی کی خودنوشت سوانح عمری 341 صفحات اور گیارہ ابواب پر مشتمل یہ کتاب اپریل 2010ء میں سالیمار آرٹ پریس سرینگر سے شائع ہوئی۔اس سوانح حیات کا اردو ترجمہ سید حبیب نے کیا ہے۔ اس سے قبل آغا اشرف کے شاگرد سید طبیب نے مصنف کی سوانح عمری ''رہنما'' کے عنوان سے بھی لکھی تھی۔اس کتاب کے بارے میں سید حبیب لکھتے ہیں:

> ''2005ء میں جب جناب جندال طبیب جی اپنے گرانقدر خدمات سے سبکدوش ہوئے آغا صاحب کے ساتھ ان کے گھر میں اٹھنے بیٹھنے اور مجلس آرائی کرنے لگے۔میں جب ان دنوں بھی کبھی کبھی آغا صاحب سے ملنے جاتا تو انہیں گرم گفتاری میں مشغول پاتا اور طبیب کو آرام سے سننے میں محو ہوتے۔معلوم ہوتا تھا کہ آغا صاحب اپنی زندگی کی کہانی طبیب جی کو سنا رہے ہیں۔جو ریکارڈ بھی ہو رہی ہے۔روز پینتالیس منٹ کا کیسٹ تیار ہوتا تھا اور 39 دنوں میں انیس کیسٹ صدر بند ہوئے

تھے کہ معلوم تھا کہ یہ کہانی میری اپنی اردو زبان میں اس
کتاب کی صورت اختیار کرے گی۔'' ۱۳؎

سوانح نگار نے اس کتاب کا آغاز'' اور بڑھتی ہوئی زندگی'' کے عنوان سے کیا ہے۔ انہوں نے اس آپ بیتی میں نہ اپنے بچپن کے دوستوں واحباب نہ اپنے بھائی، والدین اور مذہبی مکتب کا تذکرہ کیا ہے۔بل کہ انہوں نے ان تمام چیزوں کونظرانداز کر دیا ہے۔حالاں کہ آغا اشرف کی والدہ اپنے دور میں ریاستی وملکی سطح پر مختلف عہدوں پر فائز رہیں۔لیکن ان کا بھی کوئی ذکرنہیں ملتا۔ڈاکٹر علی ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔انہوں نے اپنی جاگیردارانہ شان کو بڑی بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سوانح نگار نے'' کچھ تو لکھئے کہ لوگ کہتے ہیں'' میں اپنے دادا کی مغربیت اور نانا کی مشرقی ومغربی انداز کوبھی بڑے شان اور بہتر انداز سے پیش کیا ہے۔علاوہ ازیں کشمیری پنڈتوں اور ہندوستانی فوج سے پیدا ہونے والے مسائل کے ساتھ ساتھ شیخ محمد عبداللہ اوران کے تمام کارناموں کی تفصیل بھی اس میں بیان کی ہے۔جس سے ہمیں مصنف کے عہد کو سمجھنے میں مددملتی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے اس کتاب میں اپنے دوستوں اوراحبابوں کا بھی ذکرکیاہے۔کتاب کے آخر میں مصنف نے ایک مضمون لکھا ہے۔جس میں مرداورعورت کے رشتے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مجموعی طور پراس کتاب میں فنی طور پرکچھ خامیاں ضرور ہیں،لیکن جوبھی

واقعات سوانح نگار نے قلمبند کئے ہیں ان میں حقیقت نگاری آجاتی ہے۔زبان وبیان کے اظہار سے یہ ایک بلند پایہ کتاب کہی جاسکتی ہے۔جو جموں وکشمیر کی سوانح حیات کے آغاز وارتقامیں اہم مقام رکھتی ہیں۔

''ولر کنارے'' حریت کانفرنس کے چیئر مین سید علی شاہ گیلانی کی مشہور سوانح حیات ہے۔98ابواب اور 871 صفحات پرمبنی کتاب ہے۔یہ کتاب 2011ء میں مرکزی مکتبہ حریت حیدر آباد سرینگر سے شائع ہوئی۔سید علی شاہ گیلانی کی ایک اور خودنوشت ''روداد قفس'' بھی شائع ہوچکی ہے۔''ولر کنارے'' میں گیلانی اپنی ابتدائی تعلیم اور پیدائش،اعلیٰ خاندان،سرکاری ملازمت کے ساتھ اپنے معلم کی حیثیت سے استعفیٰ اور جماعت اسلامیہ میں شامل ہونے کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے کیا ہے۔محمد دین فوق کی شخصیت کا ذکر بھی اس خوبصورت پرائے میں پیش کیا ہے۔''ولر کنارے'' میں گیلانی نے مسلمانوں کی صفات کا بھی ذکر کیا ہے۔جنہوں نے سینکڑوں ہندوؤں اور سکھوں کو قبائلیوں کے حملے سے بچایا۔بل کہ ان کے بہوؤں اور ماتاؤں کو اپنے آشیانوں میں پناہ دی اور جی جان سے حفاظت بھی کی۔

ریاست جمّوں وکشمیر ہندوستان کے ساتھ الحاق کا ذکر بھی کیا ہے۔جس سے اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ مصنف الحاق کے خلاف تھے۔انہوں نے اس کتاب میں ریاست جموں وکشمیر کے مسئلے پر بھی کھل کر بات کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

''بھارت کے حکمرانوں کا ہمیشہ یہی طرز عمل دیکھنے میں
آیا ہے کہ کشمیر کی عوام کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے۔
وہ کتنا ظالمانہ سفاکانہ انسانیت سوز اور شرم ناک بھی
ہو لیکن کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ اور نہ ہی اس کی تہہ تک
پہنچنے کی کوئی ذمہ داری نبھاتے ہیں۔'' [۱۴]

مجموعی اعتبار سے گیلانی کی اس سوانح حیات سے نہ صرف ہمیں ریاست جموں وکشمیر کی سیاست کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بل کہ جموں وکشمیر کے لئے ہندوستانی حکمرانوں ومرکزی سرکار کی پالیسوں کا بھی بخوبی علم ہوتا ہے۔ اس کتاب میں گاندھی جی، نہرو، شیخ محمد عبداللہ کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ہندو پاک کی جنگوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ زبان وبیان کی لحاظ سے بھی یہ ایک بلند ادبی کارنامہ ہے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری کا نام سوانح نگاری میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ انہوں نے ''رہگزر در رہگزر'' سوانح حیات کی ابتداء اپنے خاندان، حالات وپیشہ، آباواجداد کی ہجرت، اپنے بچپن ابتدائی تعلیم، بچپن کے احباب اور اپنے گاؤں کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ ہر واقعہ نہ صرف مصنف نے لکھا ہے بل کہ ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ کتاب انہوں نے 2013ء میں راج باغ سرینگر سے شائع کروائی۔ حامدی کاشمیری صاحب کی ''رہگزر در رہگزر'' کے بعد پروفیسر شہاب عنایت ملک

صاحب کا نام سرِ فہرست ہے۔ان کی مشہور ومعروف کتاب ''یادوں کے لمس'' ہے۔ یہ کتاب سوانح نگاری میں بلند مقام رکھتی ہے۔153 صفحات پر مشتمل یہ کتاب 2012ء میں میزان پبلشر سرینگر سے شائع ہوئی۔اس کتاب کا پیش لفظ ریاست کے مشہور اور معروف نقاد و محقق محمد یوسف ٹینگ نے لکھا ہے۔ڈاکٹر محی الدین زور نے ''میری رائے'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔ ''یادوں کے لمس'' میں پروفیسر شہاب عنایت ملک صاحب کی سوانح حیات ان کے 1965ء سے لے کر 2013 تک کے تمام حالات و واقعات شامل ہیں۔انہوں نے اپنے خاندان، پیدائش، ابتدائی تعلیم، رسم ورواج، اعلیٰ تعلیم اور جموں یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کرنے تک کے تمام واقعات شامل ہیں۔اور ان کو بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پروفیسر شہاب ملک صاحب اپنی اعلیٰ تعلیم کو مکمل کرنے کے بعد جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بحیثیت لیکچرر تعینات ہوئے اور جلد ترقی کر کے 2005ء میں ریڈر بن گے۔ان کی ترقی کو دیکھ کر بہت سے لوگوں کو برداشت نہیں ہوا کہ اتنی چھوٹی عمر میں اس نے اس قدر ترقی کی منزلوں کو چھو دیا ہے۔ بہت سے لوگ ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے ایک واقعے کا ذکر وہ اس کتاب میں کرتے ہیں ملاحظہ ہو:۔

''میں ریڈر کے عہدے پر 2005ء میں فائز ہو گیا تھا

اور شاید ظہور الدین صاحب یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ
میں اتنی کم عمر میں ریڈر بن جاوں۔ ان وجوہات کی
بنا پر دن بدن ہمارے تعلقات خراب ہوتے گئے
اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ گذشتہ چند برسوں
سے مجھے ظہور الدین سے تمام تعلقات منقطع کرنے
پڑے۔ کیونکہ مجھے اردو شعبے کو کافی بلندیوں پر پہنچانا
تھا اور ظہور الدین خواہ مخواہ ہمارے مشن میں روڑے
اٹکا رہا تھا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ کیوں نہ اس
Tension کو چھوڑ کر اُردو والوں کی بھرپور خدمت
کی جائے اور اپنے مشن کو ہر صورت میں بغیر کسی خلل یا
کسی غیر ضروری داخل اندازی کے بغیر آگے لیا جائے
اس لئے میں نے ظہور الدین سے تمام تعلقات منقطع
کر دے۔" ۱۵

اس اقتباس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ پروفیسر موصوف کو کم عمری میں صدر شعبۂ اردو رہنے کا موقع نصیب ہوا۔ پروفیسر شہاب شروع سے ہی ہمت و جرت مندی سے کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ جن شعراء و ادباء کا شمار پروفیسر صاحب کے حلقہ

احباب میں کیا ہے۔ ان میں جگن ناتھ آزاد، عرش صہبائی، وید بھسین، انند لہر، محمد یوسف ٹینگ، اسیر کشتواڑی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ''یادوں کے لمس'' میں انہوں نے جن اہم شخصیات کا ذکر کیا ہے ان میں پروفیسر امیتابھ مٹو، پروفیسر ریاض پنجابی، غلام محمد سروری، شیخ عبدالرحمٰن، مفتی محمد سعید، عبدالغنی، ملک الطاف حسین، آر ایس چپ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں اپنے اسکالروں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور جن شخصیات سے ملنے کا موقع ملا۔ ان کا بھی ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ ان شخصیات میں شری پرتبھا دیوی سنگھ پاٹل اور فلم سٹار مادھوری دکشت شامل ہیں۔

پروفیسر شہاب عنایت ملک صاحب جن اہم شخصیات سے اپنی زندگی میں متاثر ہوئے ان میں مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، یاسر عرفات، کرنل قذافی اور صدام حسین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ سوانح نگار نے گاندھی پریوار کے ساتھ ساتھ پاکستان کے بھٹو خاندان کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کسی طرح دونوں ملکوں کے خاندانوں نے اپنی قوم و ملک کے لئے اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ مصنف نے قدرت اللہ شہاب کا ذکر بھی بڑی تفصیل اور بے باکی سے کیا ہے۔

پروفیسر صاحب نے ''یادوں کے لمس'' میں کشمیری پنڈتوں کی ہجرت

جموں وکشمیر میں ملی ٹنسی کے دوران نو جوان کی شہادت اور جموں وکشمیر کے امیر طبقے کے ساتھ ساتھ غریب طبقے کی منظر کشی بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ سب ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ یا یہ سب ہماری کہانی ہے۔ یہ سب ہمارے ساتھ ہوا ہے۔

مجموعی طور پر اس کتاب کا ہر ایک واقع دوسرے واقعے کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اور جس سادگی سے بیان کیا ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جس میں حقیقت کا دامن بھی نہیں چھوٹتا ہے اور اس کتاب میں جموں وکشمیر کی تہذیبی، علمی، ادبی، سماجی اور تاریخی عکاسی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ پروفیسر شہاب عنایت ملک نے ''یادوں کے لمس'' کو لکھ کر سوانح نگاری کے باب میں ایک اہم اور بڑا اضافہ کیا ہے۔ اب تک کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ خودنوشت ہو یا سوانح عمری، انشائیہ ہو یا خاکہ، رپورتاژ ہو یا مقالات سبھی اصناف جمّوں وکشمیر کے ادب میں اہم اضافہ کرتے ہیں جن کی ادبی، سیاسی، علمی اور تاریخی اہمیت مسلم ہے۔

....☆☆☆☆....

حواشی

۱؎ عبدالقادر سروری، ''کشمیر میں اُردو (تیسرا حصّہ)''ص ۲۷۶۔

۲؎ عبدالقادر سروری، ''کشمیر میں اُردو (تیسرا حصّہ)''ص ۲۸۴۔

۳؎ برج پریمی، ''جلوہ صد رنگ'' ۱۹۸۹ء، ص ۱۹۲۔

۴؎ ملک راج صراف، ''میری پاکستان یاترا''، ۱۹۸۰ء، ص ۳۔

۵؎ اُوم پرکاش صراف، ''پاکستان میں دو دن''، ۱۹۸۲ء، ص ۸۶۔

۶؎ اُوم پرکاش صراف، ''پاکستان میں دو دن''، ۱۹۸۲ء، ص ۹۰۔

۷؎ جگن ناتھ آزاد، ''پشکن کے دیس میں''، ۱۹۸۶ء، ص ۱۰۔

۸؎ شیخ محمد اللہ، ''آتشِ چنار''، ص ۲۰۔

۹؎ شیخ محمد اللہ، ''آتشِ چنار''، ص ۲۱۔

۱۰؎ بیگم ظفر علی، ''میرے شب و روز''ص ۱۶۔

۱۱؎ قدرت اللہ شہاب، ''شہاب نامہ''، ص ۲۰۔

۱۲؎ ڈاکٹر کرن سنگھ، ''سفرِ زندگی''ص ۱۷۔

۱۳؎ آغا اشرف علی، ''کچھ تو لکھیے کہ لوگ کہتے ہیں''، ص ۱۔

۱۴؎ سیّد علی شاہ گیلانی، ''ولر کنارے''، ۴۱۔

۱۵؎ پروفیسر شہاب عنایت ملک، ''یادوں کے لمس''، ص ۵۱، ۵۰۔

..... حاصلِ مطالعہ .....

جمّوں وکشمیر میں اُردو زبان کی روایت بہت قدیم ہے۔ فارسی کے بعد اُردو زبان نے اس کی جگہ لے لی اور فروغ پانا شروع کر دیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں اگرچہ تمام سرکاری دفاتر کی کاروائیاں فارسی زبان میں ہوتی تھیں لیکن فارسی کے شانہ بشانہ اُردو زبان بھی فروغ پا رہی تھی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں اُردو زبان زیادہ ترقی نہیں کر سکی۔ اس سلسلے میں پروفیسر عبدلقادر سروری لکھتے ہیں:۔

> ''گلاب سنگھ کے عہد میں استحکام ریاست کی جد و جہد کی وجہ سے تہذیبی اور ادبی زندگی میں کچھ نمایاں ترقی نہیں ہونے پائی تاہم جمّوں اور خاص طور پر کشمیر میں فارسی لکھنے والے موجود تھے۔ انھیں اُردو سے بھی واسطہ پڑنے لگا جو اُس وقت پنجاب اور ہندوستان کے وسیع علاقوں میں پورے قد و قامت کی ادبی کا روپ اختیار کر چکی تھی۔'' [1]

مہاراجہ گلاب سنگھ کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت میں اُردو زبان وادب کو پھلنے پھولنے کا موقع نصیب ہوا۔ یہ دور اُردو ادب کے لئے عہدِ زریں ثابت ہوا کیونکہ مہاراجہ خود اس زبان سے بے حد دلچسپی رکھتا تھا۔ مہاراجہ نے اس زبان وادب کے فروغ کے لئے ریاست میں لائبریریاں اور پاٹھ شالائیں کھلوائیں۔ بیرون ریاستوں سے نقیب منگوا کر اپنے دربار میں ملازم رکھے جو فارسی داں ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ مہاراجہ کے دربار کا ایک مشہور وزیر دیوان کرپارام جو ریاست کی انتظامی صورتِ حال پر رپورٹیں مرتب کرتا تھا وہ رپورٹیں اُردو زبان میں ہوا کرتی تھیں۔ ان رپورٹوں کو ریاست میں اُردو کے ابتدائی نقوش ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مہاراجہ کے دورِ حکومت میں ۶۵-۱۸۶۴ء میں چودھری مہتہ شیر سنگھ نے بخارا کا سفر کیا۔ واپس آنے کے بعد جو اُس نے سفر نامہ لکھا وہ اُردو زبان میں تھا۔ اس سفر نامے کو ریاست میں سرکاری طور پر اُردو کی اوّلین تحریر کہا جا سکتا ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت میں اُردو زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیشِ نظر ''بدیا بلاس'' پریس اور ''بدیا بلاس'' اخبار جاری ہوئے۔ اس پریس اور اخبار نے ریاست میں اُردو زبان وادب کی ترقی میں کافی اہم رول ادا کیا۔ اسی دور میں پنڈت ہر گوپال خستہ جیسے قابلِ قدر ادیب وشاعر پیدا ہوئے جو اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر ۱۸۷۶ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ اس نے اُردو زبان وادب کی ترقی میں کئی

کارنامے انجام دیے جن میں ''گلدستۂ کشمیر'' اور ''گلزارِفوائد'' ہیں۔ ''گلدستۂ کشمیر'' کو جمّوں وکشمیر میں اُردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دیا گیا ہے۔مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہدِحکومت میں اُردوزبان کی بہت ترقی ہوئی لیکن سرکاری زبان فارسی ہونے کی وجہ سے اُردو کی پذیرائی نہیں ہوسکی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِحکومت کے بعد حکومت کی بھاگ ڈور مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے ہاتھ میں آئی تو اُس وقت اُردوزبان ریاست میں اپنا سکّہ جما چکی تھی۔لہٰذا اُردوزبان کی اس مقبولیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے پرتاپ سنگھ نے ۱۸۸۹ء میں اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا اور تمام سرکاری دفاتر،اسکولوں اور کالجوں میں یہ زبان رائج ہوگئی۔اس سلسلے میں ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں:۔

> ''مہاراجہ رنبیر سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ ۱۸۸۵ء میں تخت نشین ہوئے۔اس کے عہد تک اُردو پڑھے لکھے لوگوں کا حلقہ بڑھ گیا تھا اور اُردوزبان ذریعہ اظہار بن گئی تھی۔مہاراجہ نے اس زبان کی مقبولیت کے پیشِ نظر ۱۸۸۹ء میں اسے سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کرلیا۔'' ۲

اس عہد میں نظم ونثر دونوں اصناف پر توجہ دی گئی اوراعلیٰ پایہ کا ادب تخلیق ہوا۔

ہرگوپال خستہؔ کے چھوٹے بھائی سالک رام سالک جومہاراجہ پرتاب سنگھ کے دورِ حکومت میں مشہور شاعروادیب تھا۔ان کے قلم سے مہاراجہ نے ''مورتی منڈن''، ''دھرم اُپدیش'' اور ''شاشتر ارتھ'' جیسی دھارمک کتابیں مرتب کروائیں اس کے علاوہ انہوں نے ''لغات اُردو'' اور ''محاورات اُردو'' کے نام سے کتابچے بھی مرتب کروائے۔ لیکن ان کے ادبی کارناموں میں ''گنجینۂ فطرت''، ''داستان جگت روپ'' اور ''تحفہ سالک'' اہمیت کے حامل ہیں۔خستہؔ اور سالکؔ دونوں بھائیوں نے مل کر اُردو شعروادب کوریاست میں فروغ دیا۔غلام نبی ناظرؔ اپنے مضمون میں ان دونوں بھائیوں کے متعلق یوں لکھتے ہیں:۔

> ''انھوں نے اُردو میں اور بھی بہت کچھ لکھا اور اس طرح سے اُردو شاعری کے لئے بھی ایک ذرخیز میدان تیار ہوا۔اُن کے چھوٹے بھائی سالگ رام سالکؔ نے بھی اُردوزبان کو اپنا ذریعۂ اظہار بنا کر بہت کچھ لکھا اور اُردو قصر شاعری کی بنیاد رکھی اور انھوں نے خود کئی مثنویاں اور نظمیں بھی اُردو میں لکھیں،اس طرح وہ کشمیر کے پہلے اُردو شاعر اور پروفیسر عبدالقادر سروری کی زبان میں ''کشمیر کے دو ادب بھائی'' کے

خطاب سے موصوف ہو گئے۔'' ۳؎

خستہ اور سالک کے بعد اُردو شاعری کے میدان میں بہت سے شعراء و اُدبا نظر آتے ہیں۔ جن میں پیرزادہ محمد حسن عارف، منشی سراج الدین خان صادق، قاضی عبداللہ خان منظور، خوشی محمد ناظر، مرزا اسعد الدین سعد، منشی صادق علی صادق، منشی غلام محمد فارم، پنڈت شیو نارئین بھان، محمد دین فوق، غلام احمد مہجور، پنڈت آنند لال رتن، اسد میر اور نیاز کاشمیری وغیرہ اہم ہیں۔ ان شعراء حضرات نے اپنی ادبی کاوشوں سے اُردو شاعری کو بہت فروغ دیا۔ اور اس طرح سے اُردو شاعری ریاست میں مقبول ہوگئی۔ اس سلسلے میں عبدالقادر سروری یوں لکھتے ہیں:۔

''ریاست میں مختلف حصّوں میں علمی اور ادبی ذوق جیسا جیسا پھیلتا گیا صاحب شعور اور صاحب ذوق اصحاب کو جن میں کئی شعراء اُردو ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ آپس میں مل بیٹھنے اور علمی و ادبی موضوعات تبادلۂ خیال کے مواقع فراہم کرنے کی خواہش فطرتاً ابھرتی گئی۔ ڈوگرہ سلطنت العنان حکمرانوں کو ایسے اجتماع پسند نہیں تھے۔ اس سے

یہ خواہش دل کی دل ہی میں رہ جاتی تھی۔ آخر اس
کی صورت اس طرح نکل آئی کہ ریاست کے
ریزیڈنٹ کے دفتر میں کچھ صاحبِ ذوق منشی جو
اکھٹے ہو گئے تھے۔ انھوں نے پہل کی۔ کیونکہ
ریزیڈنسی کے علاقے میں مہاراجہ کا حکم نہیں چلتا
تھا۔ خان صاحب منشی براج الدین احمد خان امیر
منشی ریزیڈنسی نے اس خواہش کو عملی جامہ پہنایا۔'' ۴؎

اسی طرح ۱۹۲۴ء میں جموں سے پہلا اُردو اخبار ''رنبیر'' ملک راج صراف نے جاری کیا۔ اس کے بعد کشمیر سے ''وتستا''، ''ہمدرد''، ''صداقت''، ''مارتنڈ''، ''وکیل''، ''حقیقت''، ''خالد''، ''خدمت'' وغیرہ متعدد اخبارات جاری ہوئے۔ ان اخبارات میں ادیبوں اور شاعروں کی ادبی تخلیقات بھی شائع ہوئیں جن سے جموں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کو کافی فروغ ملا۔ آزادی کے بعد متعدد اخبارات اور رسائل جاری ہوئے۔ آج جموں وکشمیر سے ''شیرازہ''، ''کلیم''، ''علامت''، ''تعمیر''، ''بزمِ ادب''، ''تفہیم''، ''احتساب''، ''کشمیر اعظمیٰ''، ''اُڑان''، ''سرینگر ٹائمز''، ''تسکین''، ''ہندوستان چٹان'' وغیرہ سینکڑوں روزنامے اور ہفتہ وار اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ جو ادبی تخلیقات اور شعروادب کو پروان چڑھانے میں معروف ہیں۔

چوں کہ اُردو ریاست کی سرکاری، درباری، دفاتری اور کاروباری زبان کے علاوہ تعلیمی اداروں میں بھی اُردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ جمّوں، کشمیر اور لدّاخ میں ریڈیو اسٹیشن اور ٹیلی ویژن سینٹر سے اُردو کے پروگرام بھی پیش کیے جا رہے ہیں۔ ریاست میں سرکاری وغیر سرکاری ادبی وثقافتی انجمنیں اور ادارے بھی قبل آزادی سے لے کر آج تک اُردو زبان کے فروغ میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ جن میں انجمن ترقی اُردو، انجمن فروغ اُردو، رسا جاودانی میموریل لٹریری سوسائٹی، جموں کشمیر اُردو اکیڈمی انور شاہ، کلچرل اکیڈمی جموں وکشمیر اور تحریک بقائے اُردو وغیرہ کی توسیع و ترقی میں پیش پیش رہے ہیں۔

دیکھا جائے تو اُردو زبان وادب نے ڈیڑھ دوسو برسوں میں ہی ریاست جمّوں وکشمیر میں اتنی ترقی کر لی ہے جتنی کہ برصغیر ہندوپاک کے دوسرے ادبی مراکز ''لاہور''، ''حیدرآباد''، ''دہلی''، ''لکھنؤ'' وغیرہ نے کم وبیش ایک ہزار سال میں کی ہے۔ ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو کو بعض مسائل کا سامنا ضرور رہے لیکن اس ریاست میں اُردو کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ جمّوں وکشمیر میں اُردو کا مستقبل شاندار اور محفوظ ہی نظر آتا ہے۔

۱۹۴۷ء سے قبل جمّوں وکشمیر میں جن شاعروں اور ادیبوں نے اُردو زبان و ادب کو فروغ بخشا ان میں رامانند ساگر، پروفیسر نندلال طالب، پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، قدرت اللہ شہاب، ٹھاکر پونچھی، کنول نین پرواز، شہہ زور کاشمیری،

شوریدہ کاشمیری، محمد الدین فوق، محمد عمر نورالٰہی، غ۔م طاؤس، غلام رسول نازکی، عبدالحق برق، فقیر قلندر اور کئی شعراء واُدبا نے آزادی سے پہلے ریاست جمّوں وکشمیر میں ہی اُردو کو فروغ نہیں دیا بل کہ کم ازکم مذکورہ فنکار پنجاب اور دلی کے اُردو داں طبقوں میں بھی مقبول ہو چکے تھے۔

تقسیمِ ملک سے لے کر عصر حاضر تک جمّوں وکشمیر میں اُردو زبان وداب کی آبیاری کرنے والوں میں شمیم احمد شمیم، حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، اخبر حیدری، اکبر لداخی، پشکر ناتھ تیج بہادر بھان، برج پریمی، مخمور بدخشی، خالد حسین، رفیق راز، بلراج بخشی، اکبر جے پوری، وریندر پٹوری، محمد زمان آزردہ، ہمدم کاشمیری، عرش صہبائی، عابد منادری، قاضی غلام ریاض پنجابی، شجاع سلطان، شبنم قیوم، ترنم ریاض، ظہورالدین، محمد علی حسینی، غلام رسول ملک، شہباز راجوری، صابر مرزا، ثنا اللہ بٹ، جاوید آزرد، شفیقہ پروین، پریمی رومانی، خالد بشیر، شمس الدین شمیم، شفق سوپوری، زاہد مختار، احمد شناس، فاروق نازکی، قاسم سجاد، یوسف عاجزی، مجید مضمر (مرحوم)، نذیر ملک، شہاب عنایت ملک، نصرت آراچودھری، ضیاءالدین، محمد ریاض، اسداللہ وانی، الطاف انجم، سلیم ملک، خالد کرار وغیرہ کے نام سرِ فہرست ہیں جنہوں نے اپنی محنت و خلوص سے جموں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کی آبرو بنائے رکھی۔

مذکورہ شعراء واُدبا نے جہاں ایک طرف روایتی موضوعات کو پیش کیا ہے وہیں

دوسری طرف اقوامی اور بین الاقوامی سطح پر چل رہی تحریکوں کے اثرات بھی قبول کیے جو ان کی تخلیقات میں صاف نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی کی شروعات میں ریاست کے اندر بھی جنگ جیسے حالات بن چکے تھے۔ یہاں کی قومیں شخصی راج سے تنگ آکر ان کے خلاف سراپا احتجاج ہو گئیں تھیں۔ پوری ریاست کے حالات ابتر ہو چکے تھے اور یہاں کی عوام سیاسی، سماجی اور معاشی انتشار میں مبتلا تھی۔ ان حالات کو منظّم کرنے کے لئے ملک کی طرح ریاست میں بھی Progressive Writers Association کا انعقاد کیا گیا جس کے پرچم تلے یہاں کے فنکاروں کو نئے موضوعات کا پلیٹ فارم فراہم ہوا جو ترقی پسند تحریک کا ہی حصّہ تھا۔ ریاست میں جن شعراء نے ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر شاعری کی ان میں حامدیؔ کاشمیری، غلام رسول نازکیؔ، رحمٰن راہیؔ، شفقؔ سوپوری وغیرہ قابل ذکر ہیں جن شعراء حضرات نے ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر اپنے جوہر دکھائے ان میں شہ زور کاشمیری کے کلام میں ترقی پسندی کے تجربات و احساسات بدرجہ اُتم پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے ترقی پسندی کے خیالات کا اظہار زیادہ تر نظموں میں کیا ہے۔ اُن کی نظم ''پری محل'' میں ترقی پسندی کے اشعار اس طرح ہیں:۔

؎ سُرخ رنگوں سے ہے یوں خاک چمن مہکی ہوئی
ہو چمن میں جس طرح گُل کی قباہ دہکی ہوئی

شہ زور کاشمیری کی غزلوں میں جو ترقی پسندی کا تصّور ملتا ہے۔ وہ فیض احمد فیضؔ کی غزلوں سے مماثلت رکھتا ہے۔

؎ حاکم کا سیل صبر ابھی تند و تیز ہے
ہر اک دیار آج بھی محکوم خیز ہے
خواجہ پرست آج بھی مزدور ہے یہاں
پائے خدائے زر پہ گدا سجدہ ریز

ریاست میں رساؔ جاودانی کی شاعری میں بھی ترقی پسندی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ رساؔ کے دوشعری مجموعوں میں ''لالۂ صحرا'' اور ''نظم ثریا'' ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں کے اشعاروں میں ترقی پسندی کے عناصر کثرت سے ملتے ہیں۔ اس کا نمونہ یوں ہے:۔

؎ ایسی بستی ہو جہاں لوگ ہوں سارے انسان
کوئی ہندو ہو وہاں اور نہ مسلمان کوئی
میں ایک مذہب وحدت کا یوں بنا ڈالوں
کرلوچ دل سے پرنقش روئی مٹا ڈالوں
جو تنگ نظر کم ظرفی سے قطرے کو سمندر کہتا ہے
قلزم کی حقیقت کیا سمجھے وہ وسعت دریا کیا جانے

رساؔ جاودانی کی ترقی پسندی بالکل مختلف ہے جس میں نہ صرف انسانی دوستی بل کہ آپسی بھائی چارہ بھی شامل ہے۔

کبھی نہ مسجد و مندر میں امتیاز کروں
بتوں کی کر کے پرشش ادا نماز کروں
طواف کعبہ کو جاوں رہ بنارس سے
خُدا سے ملنے کی خاطر بتوں سے ساز کروں

تو اس طرح سے رساؔ جاودانی کے کلام میں ترقی پسندی کے عناصر پائے جاتے ہیں ۔آزادی کے بعد جن شعراء حضرات نے ترقی پسندی کو اپنی غزلوں اور نظموں میں برتا ہے اُن میں سے چند کے نام یوں ہیں۔رحمٰن راہیؔ، قیصر قلندرؔ، محمد امین کاملؔ، عرش صہبائیؔ، شفقؔ سوپوری، رفیقؔ راز لطف، غلام رسول نازکیؔ، ڈاکٹر صابرؔ مرزا، پرتپال سنگھ بیتابؔ، احمد شناسؔ۔ یہ وہ شعراء حضرات ہیں جن کے کلام میں ترقی پسندی کے عناصر پائے جاتے ہیں اور جنہوں نے ترقی پسندی سے متاثر ہو کر ادب تخلیق کیا ہے۔

افسانہ نگاری کی اگر بات کی جائے تو اس میں بھی ترقی پسندی کے عناصر ملتے ہیں۔ اس کی مثال پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں میں ملتی ہے کیوں کہ جب پریم ناتھ پردیسی نے لکھنا شروع کیا تو اُس وقت ترقی پسند تحریک پروان چڑھ رہی تھی تو اس کے اثرات پردیسی کے افسانوں پر بھی پڑے۔حالانکہ پہلے انھوں نے رومانی کہانیاں لکھی

تھیں لیکن جب ''انگارے'' کی اشاعت ہوئی تو انھوں نے ترقی پسندی کی طرف دھیان دینا شروع کر دیا۔ اور ریاست میں پریم ناتھ پردیسی کی کوششوں کی وجہ سے ہی ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔ اس بارے میں پروفیسر اسد اللہ وانی یوں لکھتے ہیں:۔

> ''آپ کا (پردیسی کا) جمّوں و کشمیر ترقی پسند ادبی تحریک کی بنیاد ڈالنے والوں میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے اس وقت ملک کے سیاسی، سماجی اور ادبی سطح پر بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیا۔'' ۵

پردیسی کے افسانہ ''بہتے چراغ'' میں ترقی پسند تحریک کے اثرات نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ پردیسی کے بعد پریم ناتھ در کا نام ترقی پسندی کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کے دو افسانوی مجموعے ہیں ''کاغذ کا واسدیو'' اور ''نیلی آنکھیں''۔ ''کاغذ کا واسدیو'' میں پریم ناتھ در نے ایک غریب کسان کی زندگی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کس طرح اپنے بچّوں کو مری ہوئی ماں کی یاد سے محفوظ رکھتا ہے اور ان کو زندگی میں ہر خوشی دینے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اُس کے بچّوں کو زندگی میں کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو۔ اور آخر ایک روز برف کے تودے ہٹاتے ہٹاتے زندگی کی تھکان سے چور چور واسدیو بچّوں کو ہنستا ہنستا دُنیا سے رُخصت ہوتا ہے۔

پریم ناتھ در کے بعد کشمیری لال ذاکر کا نام ترقی پسند تحریک کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ترقی پسند سے متاثر ہوکر کشمیری لال ذاکر نے کئی افسانے لکھے۔ اُن کا ایک افسانہ ''جب کشمیر جل رہا ہے'' ہے۔اس افسانے میں ترقی پسندی کے عناصر ملتے ہیں۔ان کے بعد موہن یاور کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے تین افسانوی مجموعے۔''وسکی کی بوتل''، ''تیسری آنکھ'' اور ''سیّاہ تاج محل'' جیسے افسانوں میں بھی ہمیں ترقی پسند تحریک کے اثرات ملتے ہیں۔ان کے علاوہ جن ادیبوں نے ترقی پسند ادبی تحریک کے موضوعات کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی ان میں ٹھاکر پونچھی بھی ہیں جو فرائیڈ کے نظریے کے حامی تھے۔قدرت اللہ شہاب کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔انہوں نے ''شہاب نامہ'' میں ریاست جمّوں وکشمیر میں ترقی پسند تحریک اور تحریکِ آزادی کے حوالے سے بعض سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔شیخ محمد عبداللہ کی سوانح حیات ''آتشِ چنار'' کے بعد ''شہاب نامہ'' ہی دوسری کتاب ہے جس میں اس ریاست کی تحریکِ آزادی کے بعض ان گوشوں پر روشنی پڑتی ہے جس سے ریاست کے لوگ ناواقف تھے۔

''یا خدا'' ان کا بہترین افسانہ ہے جو تقسیمِ ہند پر لکھا گیا ہے۔ تو اس طرح سے ریاست میں افسانہ نگاروں نے ترقی پسند تحریک کے اثرات قبول کیے کیوں کہ ریاست میں اُس وقت حالات ہی ایسے تھے کہ افسانہ نگار اس تحریک

کے اثرات قبول کرنے کے لئے مجبور ہو گے۔

ناول کی اگر بات کی جائے تو اس کی عمدہ مثال راما نند ساگر کا ناول ''اورانسان مرگیا'' ہے۔جس میں ترقی پسند تحریک کے اثرات نمایاں ہیں۔پریم ناتھ پردیسی نے ایک ناول ۱۹۴۷ء میں ''پوتی'' کے عنوان سے لکھا جو تقسیم کے وقت تلف ہو گیا۔لیکن پردیسی نے ترقی پسند تحریک کے بہت سے کام سرانجام دئے۔

پردیسی کے بعد کشمیری لال ذاکر کا نام آتا ہے۔انھوں نے بہت سے ناول لکھے۔ ''سمندر صلیب'' تحریکِ آزادی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔''جاتی ہوئی رُت'' اس ناول میں مرد کے اوّلین رہنے والے سماج میں کس طرح عورت دوسرے درجے کی چیز بن جاتی ہے۔اُن کا یہ ناول سماج پر طنز ہے کہ عورت کو آج بھی کئی استحصال سے گزرنا پڑتا ہے۔کشمیری لال ذاکر کے ناولوں میں کشمیر کی خوشبو نظر آتی ہے۔وہ سماج کی بداعنوں کو دور کرنا چاہتے تھے،رشوت خوری اور مذہب کے نام پر استحصال کے عزیز ترین موضوع میں صاف ستھرا سماج چاہتے تھے۔

کشمیری لال ذاکر کے بعد نرسنگھ داس نرگس کا نام بھی ترقی پسندی کی صف میں آتا ہے۔ان کے اب تک تین ناول ''پاربتی''، ''نرملا'' اور ''جانکی'' شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔''پاربتی'' ناول کا مزاج منشی پریم چند کے ناولوں کے مزاج کے ساتھ جاملتا ہے۔''جانکی'' اور ''نرملا'' ناولوں میں مظلوم اور دیہی خواتین کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

انھوں نے اپنے ناولوں میں سماج کی بھرپور طریقے سے عکاسی کی ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی نرسنگھ داس نرگس کی ناول نگاری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:۔

''انھوں نے اپنے ناولوں میں سماجی مسائل کو اپنا موضوع بنایا اور سماج کی بدعنوں کی تصویر کشی کی۔ نرگس خاص طور سے دیہاتوں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے چونکہ عمر عزیز کا بیشتر حصّہ دیہاتوں میں گزرا ہے۔ اس لئے ان کے ناولوں کے کردار اپنے لوگ ہیں جو رسم ورواج کی چھوکٹ پر قربان ہونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ نرگس اپنے ناولوں میں اپنے اصلاحی مقصد کو پیش کرتے ہیں۔'' ۶

نرسنگھ داس نرگس کے بعد ٹھاکر پونچھی کا نام آتا ہے۔ ٹھاکر پونچھی کرشن چندر سے کافی حد تک متاثر تھے۔ ان کے ناولوں نے عوام کو حقیقت سے روشناس کر دیا ہے۔ وہ حقیقت پسند تھے اور سیدھے راستے پر چلنے کا درس دیتے تھے۔ تو ان کے ناولوں میں بھی ترقی پسندی کے عناصر ملتے ہیں۔ ان کے بعد تیج بہادر بھان کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے، ان کا ایک ناول بعنوان ''لال چُنری'' ہے۔ اس ناول میں حقیقت نگاری اور سیاسی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ کئی اور ناول نگار ہیں جن کے ناولوں

میں ترقی پسندی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ان میں علی محمد لون، حامدی کاشمیری، آنند لہر، ترنم ریاض وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ ناول نگار ہیں جن کے ناولوں میں ترقی پسندی کے عناصر ملتے ہیں۔ان ناول نگاروں نے اُس وقت کے سماج کی بھر پور عکاسی ترقی پسندی کی شکل میں کی ہے۔ اور ان کے سوئے ہوئے دلوں کو اپنے ناولوں اور افسانوں سے جگانے کی کوشش کی ہے۔اُس وقت افلاس، بھوک، لاچاری، فسادات، قتل غارت سب کچھ انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں پیش کیا ہے۔

اس طرح غیر افسانوی ادب کی بات کی جائے تو اس میں بھی ترقی پسندی کے نمایاں اثرات ملتے ہیں۔غیر افسانوی ادب میں انشائیہ، خودنوشت اور سوانح عمری میں ترقی پسندی کے عناصر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔جہاں تک انشائیہ کا تعلق ہے تو انشائیہ نگاروں میں شیخ محمد عبداللہ، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر زماں آزردہ، سید علی شاہ گیلانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان کے یہاں ترقی پسندی کے عناصر ملتے ہیں۔

سفرنامے کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو بہت سارے سفرنامے ہیں جن میں ترقی پسندی کے عناصر ملتے ہیں۔

(۱)۔''میری پاکستان یاترا''، ملک راج صراف۔

(۲)۔''پاکستان میں دودن''، اوم پرکاش صراف۔

(۳)۔ ’’پشکن کے دیش میں‘‘، جگن ناتھ آزاد۔

(۴)۔کولمبس کے دیس میں‘‘، جگن ناتھ آزاد۔

(۵)۔ ’’روس کا سفر‘‘، صوفی غلام رسول۔

(۶)۔ ’’پاکستان کا سفر‘‘، خواجہ نثار۔

(۷)۔ ’’پاکستان کا سفر‘‘، حامدی کاشمیری۔

(۸)۔ ’’پاکستان کا سفر‘‘، وجیہہ احمد اندابی۔

مذکورہ سفر ناموں میں کہیں کہیں ہمیں ترقی پسند تحریک کے اثرات شعوری اور غیر شعوری طور پر ملتے ہیں۔

اس کے بعد سوانح حیات میں بھی ہمیں ترقی پسندی کے عناثر ملتے ہیں اور جن سوانح حیات میں ترقی پسندی کے عناصر ملتے ہیں وہ یوں ہیں۔ ’’آتش چنار‘‘، ’’بوئے گل‘‘، ’’دو چراغ‘‘، ’’سرگشت فوق شہاب نامہ‘‘، ’’سفرِ زندگی‘‘، ’’یادوں کے چراغ‘‘، ’’کچھ تو لکھئے کہ لوگ کہتے ہیں‘‘، ’’ولر کے کنارے‘‘، ’’یادوں کے لمس‘‘ وغیرہ سوانح حیات ہیں جن میں ترقی پسند تحریک کے اثرات ملتے ہیں کیوں کہ ان ادیبوں نے ریاست کے متعلق ترقی پسندی کے حوالے سے متاثر ہو کر لکھا ہے اور اس وقت جو حالات تھے اُس کی ان ادیبوں نے بھرپور عکاسی کی ہے۔

مختصراً یہ کہ ترقی پسند ادبی تحریک ایک عالم گیر تحریک تھی جس نے ہندوستان کی

دیگر ریاستوں کے ساتھ ساتھ جمّوں و کشمیر کے ادبی ذخیرے کو بھی متاثر کیا جس کی مثال یہاں کے شعر و ادب میں بدرجہ اُتم موجود ہے۔ یہاں کے شعراء و اُدبا حضرات نہ صرف اس تحریک سے متاثر ہوئے بل کہ اس تحریک کے منشور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مختلف تخلیقی موضوعات پر خامہ فرسائی بھی کی اور بہت حد تک اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ اگر چہ یہ تحریک ختم ہو چکی ہے لیکن اس کے عطا کردہ موضوعات پر آج بھی اُردو کی ادبی دُنیا میں لکھا جا رہا ہے۔

یہ سچ ہے چند لمحوں کے لئے بسمل تڑپتا ہے
پھر اُس کے بعد ساری زندگی قاتل تڑپتا ہے

☆ ☆ ☆ ☆

حواشی

۱؎ عبدالقادر سروری، ''کشمیر میں اُردو (حصّہ اوّل)''، ۱۹۸۲ء، ص ۸۶۔

۲؎ ڈاکٹر برج پریمی، ''جمّوں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشو نما''، ۲۰۱۳ء، ص ۲۱،

۳؎ غلام نبی ناظر، ''کشمیر میں اُردو شاعری کے پچاس سال'' شیرازہ (جموں میں اُردو ادب کے پچاس سال)
ص ۱۱۶۔۱۱۷۔

۴؎ عبدالقادر سروری، ''کشمیر میں اُردو (حصّہ اوّل)''، ۱۹۸۲ء، ص ۲۲۴۔

۵؎ ''ہمارا ادب''، جمّوں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر، انتخاب نمبر ۷۹، ۱۹۷۸ء، ص ۳۴۱۔

۶؎ ڈاکٹر برج پریمی، ''جمّوں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشو نما''، ۲۰۱۳ء، ص ۴۴،

☆☆☆

..... کتابیات .....

نمبر شمار	مصنف	کتاب کا نام	ناشر	سنِ اشاعت
۱	ابواللیث صدیقی (ڈاکٹر)	آج کا اُردو ادب	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۵ء
۲	احمد ندیم قاسمی	آبلے	ادارہ فکرِ جدید دہلی	۱۹۹۳ء
۳	اسرارالحق مجاز	کُلیاتِ مجاز	کتابی دُنیا دہلی ۶،	۲۰۰۲ء
۴	اطہر نبی	ترقی پسند تحریک	نصرت پبلشنگ ہاؤس امین آباد لکھنؤ	۱۹۸۱ء
۵	برج پریمی (ڈاکٹر)	جموں وکشمیر میں اُردو کی نشوونما (تنقید وتحقیق)	رچنا پبلی کیشنز نصیب نگر، پمپوش کالونی، جموں۔	۱۹۹۲ء
۶	پریمی رومانی (مرتب)	چند تحریریں: ڈاکٹر برج پریمی	رچنا پبلی کیشنز نصیب نگر، پمپوش کالونی، جموں۔	۱۹۸۸ء
۷	پریمی رومانی (مرتب)	مشاہیر ادب کے خطوط ___ برج پریمی کے نام	رچنا پبلی کیشنز نصیب نگر، پمپوش کالونی، جموں۔	۲۰۱۰ء
۸	پریمی رومانی	فکر ونظر	رچنا پبلی کیشنز نصیب نگر، پمپوش کالونی، جموں۔	۲۰۱۲ء
۹	جان نثار اختر	ہندوستان ہمارا	ہندوستانی بک ٹرسٹ بمبئی	۱۹۷۴ء
۱۰	حامدی کاشمیری (پروفیسر)	جدید اُردو نظم اور یورپی اثر	اموڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی	۲۰۱۰ء
۱۱	خلیل الرحمٰن اعظمی	اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۷۹ء
۱۲	رالف رسل	ترقی پسند ادب پچاس سالہ	ایجوکیشنل ہاؤس دہلی	۱۹۸۹ء
۱۲	سجاد ظہیر	کیفیات	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس	۲۰۰۳ء

			دہلی	
۱۳	سروری عبدالقادر	اُردو کی ادبی تاریخ	شیخ عثمان اینڈ سنز گاؤں کدل سرینگر	۱۹۷۵ء
۱۴	سروری عبدالقادر	کشمیر میں اُردو (پہلا حصّہ)	جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز سرینگر	۱۹۸۴ء
۱۵	سروری عبدالقادر	کشمیر میں اُردو (دوسرا حصّہ)	جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز سرینگر	۱۹۸۴ء
۱۶	سلیمان اطہر جاوید (ڈاکٹر)	ادب کا بدلتا مزاج	ماڈرن پبلی کیشنز، دہلی	۲۰۰۱ء
۱۷	سید شاہ محمد	تحقیقی مقالے	عظیم الشان بکڈ پو سلطان گنج	۱۹۶۵ء
۱۸	سید شاہ رشید	تنقیدی مضامین	عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ	۱۹۷۰ء
۱۹	شارب ردولوی	ہندوستانی ادب کے معمار اسرار الحق مجاز	ساہتیہ اکیڈمی	۲۰۰۹ء
۲۰	شمس الرحمٰن فاروقی	ماہنامہ کتاب نما	فاروقی مکتبہ جامعہ دہلی	۲۰۰۲ء
۲۱	شاہد ماہلی	نئی گلستان (حصّہ اوّل)	معیار پبلی کیشنز دہلی	۲۰۰۸ء
۲۲	شاہد ماہلی	نئی گلستان (حصّہ دوئم)	معیار پبلی کیشنز دہلی	۲۰۰۸ء
۲۳	صغیر افراہیم (ڈاکٹر)	اُردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	۱۹۸۱ء
۲۴	صہبا (فرید) لیاقت علی	مجاز کی باتیں	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ	۲۰۰۸ء
۲۵	عبدالغنی	فیض کی شاعری	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ	۲۰۰۱ء

۲۶ عتیق اللہ (ڈاکٹر) ترقی پسند ادب پچاس سالہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۸۷ء

۲۷ عزیز احمد ترقی پسند ادب خواجہ پریس دہلی ۱۹۴۵ء

۲۸ فیض احمد فیضؔ سر وادیِ سینا نیا ادب پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۱ء

۲۹ فیض احمد فیض کلامِ فیض ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۷ء

۳۰ قمر رئیس (پروفیسر) ترقی پسند ادب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۹ء

۳۱ قمر رئیس عاشور کاظمی ترقی پسند ادب سیما پبلی کیشنز، نئی دہلی ۱۹۸۵ء
پچاس سالہ سفر

۳۲ کمال احمد صدیقی ترقی پسند ادب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۹ء

۳۳ کیفی اعظمی دیباچہ، آوارہ سجدے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۳ء

۳۴ گوپی چند نارنگ ساختیات پس ساختیات ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء
اور مشرقی شعریات

۳۵ علامہ اقبال کُلیاتِ اقبال فرید بک ڈپو پرائیوٹ لمیٹڈ ۲۰۰۴ء
نئی دہلی

﴾.... ☆☆☆☆ ....﴿

رسائل

نمبر شمار	رسائل و جرائد	مدیر	مقام اشاعت
۱۔	اردو دنیا، ماہنامہ رسالہ	محمد حمید اللہ بٹ	قومی قونسل برائے فروغ نئی دہلی
۲۔	آج کل، ماہنامہ رسالہ	خورشید اکرم	نئی دہلی
۳۔	ادب ساز، ماہنامہ رسالہ	نصرت ظہیر	کھچڑی پور، دہلی
۴۔	امکان، ماہنامہ رسالہ	ملک زادہ منظور احمد	لکھنؤ
۵۔	انتخاب نثر اردو مجلّہ	خواجہ اکرام الدین	قومی کونسل برائے فروغ اردو
۶۔	انشاء	ف۔س۔اعجاز	کلکتہ
۷۔	ایوانِ اردو، ماہنامہ رسالہ	انیس اعظمی	دہلی
۸۔	بے باک، ماہنامہ رسالہ	احمد عثمانی	مالیگاؤں، مہاراشٹر
۹۔	پروازِ ادب، ماہنامہ	بلبیر کور	پنجاب
۱۰۔	پیامِ اردو، ماہنامہ	سعادت احمد	حیدرآباد
۱۱۔	تحریرِ نو، ماہنامہ	ظہیر انصاری	ممبئی
۱۲۔	تسلسل، سہ ماہی مجلّہ	شہاب عنایت ملک	شعبۂ اردو جموں یونی ورسٹی، جموں (توی)
۱۳۔	تہذیب الاخلاق، ماہنامہ	صغیر افراہیم	علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی
۱۴۔	فکر و تحقیق	خواجہ محمد اکرام الدین	نئی دہلی
۱۵۔	شاعر، ماہنامہ	افتخار حسین	ممبئی
۱۶۔	ہمارا ادب، سال نامہ	محمد اشرف ٹاک	جموں و کشمیر
۱۷۔	تحریک ادب، سہ ماہی	جاوید انور	اردو آشیانہ، وارانسی، یوپی، انڈیا

.... اخبارات اور جرائد ....

نمبر شمار	نام جرائد	مقامِ اشاعت
۱۔	اُڑان، روزنامہ	جموں
۲۔	برق خاطف، ہفتہ وار	ممبئی
۳۔	خدمت، روزنامہ	سری نگر
۴۔	زمیندار، روزنامہ	سری نگر
۵۔	سب رس	حیدرآباد
۶۔	عقاب، روزنامہ	سری نگر
۷۔	کشمیر اعظمیٰ	سری نگر، جموں
۸۔	ہند سماچار	جالندھر